بیادِ پروفیسر سید منظر حسن دسنوی مرحوم
اور سید شکیل دسنوی مرحوم
شعر و ادب کی صالح قدروں اور عصری رجحانات کا ترجمان
سہ ماہی ادبی محاذ کٹک

اشاعت کا تیرھواں سال	۵۳ / واں شمارہ

سرپرست: انجینئر سید آصف دسنوی
مدیر اعلیٰ: سعید رحمانی
موبائل۔ 07735860991 (صرف SMS کے لیے)
08763623951 (برائے SMS)

مدیر — سید نفیس دسنوی Mob:9437067585
معاون مدیر — سیّد نور الٰہی ناطق Mob:9237427933

منیجنگ ایڈیٹر
سمیع الحق شاکر موبائل 9861148800
کمپیوٹر کمپوزنگ: ۔سید مصطفٰی علی موبائل ۔8984218600

مجلس مشاورت
الحاج سید عطا محی الدین، نذیر احمد یوسفی، رؤف خیر، ڈاکٹر اسلم حنیف، پروفیسر احتشام اختر، ظفر اقبال ظفر، رفیق شاہین، شارق عدیل، احسن امام احسن، غلام ربانی فدا، اشفاق نجمی، حیرت فرخ آبادی، عبدالمتین جامی، حبیب سیفی، شیخ منور حبیبی، حفیظ فاروقی، شیخ قریش
قانونی مشیر: محمد فیض الدین خاں (ایڈوکیٹ، ہائی کورٹ)

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ
سعید رحمانی، اخبار اڑیسہ پبلی کیشنز، دیوان بازار۔ پوسٹ۔ بخشی بازار، کٹک۔
09437067585753001 (ضروری جانکاری کے لیے)
E-mail: adbimahaz@gmail.com
E-mail: Sayeedrahmani@gmail..com
Website: www.sayeedrahmani.blogspot.com
www.adbimahaz.yolasite.com

قیمت فی شمارہ: ۲۵/روپے زرِ سالانہ: ۱۰۰/روپے
رجسٹری ڈاک سے زرِ سالانہ۔ ۱۸۰/روپے
خصوصی زرِ سالانہ: ۲۰۰/روپے بیرونِ ممالک: ۲۵/امریکی ڈالر
(چیک یا ڈرافٹ پر نام کی جگہ صرف Md. Sayeed لکھیں۔ پتہ نہ لکھیں۔ چیک کے ذریعہ زرِ سالانہ ۱۲۵/روپے ارسال کریں۔ بیرونِ ملک کے لئے ۳۰/امریکی ڈالر)
IndianOverseasBank-A/CNo.172201000001688
IFSC Code-IOBA 0001722-Branch-HaripurRoad,Cuttack
عدالتی چارہ جوئی صرف کٹک کی عدلیہ میں قابلِ سماعت ہوگی
مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

پبلیشر و پرنٹر شیخ قریش نے چتا پریس قاضی بازار سے چھپوا کر دیوان بازار کٹک سے شایع کیا

یادوں کی دہلیز سے
سید شکیل دسنوی مرحوم

غزل

چھلک اٹھیں گی آنکھیں ناگہاں جب ہم نہیں ہوں گے
بہت ڈھونڈو گے ہم کو مہرباں جب ہم نہیں ہوں گے

کہاں پائے گا پھر لمسِ جبینِ شوقِ وارفتہ
تڑپ اٹھّے گا سنگِ آستاں جب ہم نہیں ہوں گے

بہت برقِ حوادث بھی ہمارے بعد تڑپے گی
کرے گی خاک کس کا آشیاں جب ہم نہیں ہوں گے

اٹھائے گا ترے جور و ستم یوں کون ہنس ہنس کر
ستائے گا کسے اے آسماں جب ہم نہیں ہوں گے

سفینہ آرزو کا غرق یوں لاکر لبِ ساحل
کرے گا کون بحرِ امتحاں جب ہم نہیں ہوں گے

مرسلہ
عبدالمجید فیضی (سمبلپور، اڈیشا)

سنہء

ہمارے خصوصی معاونین

اپنی پنشن کی رقم سے ''اخبارِ اڑیسہ'' کا لگایا ہوا پوداب اللہ کے فضل وکرم سے برگ وبار لاکر سہ ماہی ''ادبی محاذ'' کی صورت میں ارتقائی سفر طے کرنے لگا ہے۔میری تنہا ذاتی کوششوں سے شروع کیا ہوا یہ سفراب 'لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا' کے مصداق ایک ادارے کی شکل اختیار کر گیا ہے جس میں مقامی احباب کے دامے درمے سخنے تعاون کے ساتھ ہی کل ہندسطح پر دیگر محبان اردو نے اپنی طرف سے ایک ہزار سے لے کر پانچ ہزار تک کے عطیات دیے ہیں اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ان میں سے بعض نے وقفے وقفے سے رقم بھیجتے رہنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔تمام محبان اردو سے نہ صرف کل ہند بلکہ عالمی سطح پر بھی لائف ممبر شپ قبول کرنے کی گزارش ہے۔

خصوصی معاونین کے اسمائے گرامی

نام	مقام
الحاج محمد ایوب خاں	بھوبنیشور
الحاج سیّد عطامحی الدین	بھدرک
الحاج سیّد ڈاکٹر مشتاق علی	کٹک
الحاج مولوی سیّد نذیر الدین صدیقی (ایڈوکیٹ)	کٹک
جناب محمد شاہنواز	بھوبنیشور
جناب سہیل اختر	بھوبنیشور
جناب عبدالمجید فیضی	سمبل پور
جناب ایم اے احد	بھوبنیشور
جناب محمد اسلم غازی	ممبئ
جناب سیّد علی شبنم کارواری	تھانے
ڈاکٹر محمد قمر الدین خاں	کٹک
جناب ایس این شیخ	ممبئ
مولوی محمد مطیع اللہ نازش	کٹک
جناب شیخ منور احمد حبیبی	دھام نگر (اڑیسہ)
جناب محب الرحمٰن وفاؔ	یوڈا،مہاراشٹر
جناب وکیل نجیب	ناگپور
جناب سیّد محمود رضی الدین	راجستھان
جناب اقبال سلیم۔	بنگلور

نام	مقام
جناب ایم حمید الدین ناز	بیدر
پالوجی ڈاکٹر جاوید حسین	ممبئ
مس انجم ممتاز سلطانہ	بیدر
جناب رفیق شاہین	علی گڑھ
جناب سمیع الحق شاکر۔	کٹک
ڈاکٹر سید مجیب الرحمٰن بزمیؔ	رانچی
ڈاکٹر جمال الدین احمد	بھوبنیشور
ڈاکٹر کرشن بھاوک۔	پٹیالہ
سید فرید منظر حسن۔	کٹک
ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی	نیپال
ڈاکٹر قمر الزماں۔	دھنباد
جناب بی۔ایس۔جین جوہرؔ	میرٹھ
مولانا پھول محمد نعمت رضوی	مظفر نگر (بہار)
جناب ارشد قمر	ڈالٹن گنج
ڈاکٹر ملکہ خورشید	لکھنؤ
حاجی اختر حسین	بیل پہاڑ۔جھارسوگڈا
جناب جمال قدوسی	سدھارتھ نگر (یوپی)
جناب شمس الحق شمسؔ (ایڈوکیٹ)	دیوپور (کٹک)

نام	مقام
ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری	کٹک
ابوالکمال ظفر احمد (ایڈوکیٹ)	بالیسر
جناب ارشد جمیل	کٹک
جناب شیخ بشیر احمد	کشمیر
جناب نظام مجھولیاوی	مظفر پور (بہار)
جناب رمیش پرساد کنول	پٹنہ
جناب اسحاق عابد	چنئ
ڈاکٹر مختار شمیم	بھوپال
بانو مہر سلطانہ بنت حمید الدین	بیدر (کرناٹک)
جناب جاوید ندیم	ممبئ
جناب فیروز احمد سیفی	نیویارک (امریکہ)
پروفیسر سید محمد استخار الدین	بجنور (یوپی)

ماہنامہ **رنگ وبو**

مدیر۔صاحبزادہ مجتبیٰ فہیم معاون مدیرہ۔سیدہ ذکیہ

قیمت۔فی شمارہ۔۱۵؍روپے زرِ

ادبی محاذ کے گوشے

اگلے شمارے میں شعری مجموعہ ''باغِ تصور'' کے خالق اوراڑیسہ کے ایک معروف شاعر صلاح الدین تسکینؔ کے گوشے کا انتظار کریں۔موصوف کی غزلیہ شاعری سلاستِ زبان وبیان کے ساتھ جذبے کی طہارت اور فکری صلابت کی آئینہ دار ہے۔

آپ چاہیں تو آپ کے فکروفن کے اعتراف میں بھی ایک مبسوط گوشہ شایع ہوسکتا ہے۔ضروری تفصیلات کے لیے اس نمبر پر رابطہ کریں:09437067585

ایک ضروری تصحیح

گزشتہ شمارے کے صفحہ ۴۳؍ پر حیرت فرخ آبادی صاحب کی ایک غزل میں پروف کی چند خامیاں رہ گئی ہیں۔تیسرے مصرع کے پہلے مصرعے میں کچھ کے بعد لفظ ''یار'' چھوٹ گیا ہے۔درست مصرع یوں ہے:

کچھ یار میرے پارسا ناراض ہیں دشمن بھی ہیں

چوتھے شعر میں ''چنا'' کی جگہ ''کہا'' ہوگیا ہے اور پانچویں شعر میں ''لاپتا'' کی جگہ ''لاپتہ'' چھپ گیا ہے۔مصرع یوں ہوگا:۔

مجھ سے بہت مانوس تھا ہے لاپتا دیوانگی

اس شمارے میں

محاذِ اول

قاضی مشتاق احمد
B/6,RAY.VENUE SOCITEY
I.C.S.Colony,Pune-411007(M.S)

انتخابی وعدے: غضب کیا تیرے وعدوں پہ اعتبار کیا

۲۰۱۴ء کے انتخابات جیتنے کے لئے مودی اور بی جے پی نے جو وعدے کیے تھے ''سب کا ساتھ سب کا وکاس'' اور دوسرا وعدہ تھا'' زیادہ سے زیادہ نظم وضبط اور کم سے کم حکومت''۔ ہندتوا، مندر مسجد مسئلہ، کامن سول کوڈ، سارے معاملات ٹھنڈے بستے میں رکھ دیئے گئے تھے۔قومی میڈیا نے بھی عوامی مسائل سے زیادہ ''شخصی سیاست'' پر زور دیا اور نریندر مودی کی کرشماتی شخصیت نے وزارت عظمیٰ کی کرسی سنبھال لی۔ حالانکہ خود وزیر اعظم نریندر مودی نے قبرستان اور شمشان، عید اور دیوالی پر بیان دے کر انتخابی موسم میں ہی اپنا اصلی رنگ دکھا دیا تھا۔ بی جے پی کے قومی صدر امیت شاہ نے بہار کے انتخابات کے دوران یہ کہہ کر یوپی میں ہندو ووٹ بینک کو مضبوط کر لیا کہ ''اگر بی جے پی ہار جائے گی تو پاکستان دیوالی منائے گا''۔ان حالات میں بھی مسلمانوں نے ترقی کے نام پر بی جے پی کو جتایا لیکن اقتدار میں آتے ہی بی جے پی اپنے وعدوں سے مُکر گئی۔ آر ایس ایس ہیڈ کوارٹر سے جاری کیے گیے فرمان کی بنا پر عین وقت پر یوپی کے وزیر اعلیٰ کے طور پر راجناتھ سنگھ کے بجائے مسلم مخالف یوگی آدتیہ ناتھ کو منتخب کیا گیا۔ اس سے یہ پیغام ملا کہ اس سیکولر ملک میں ہندتوا کا نظام قائم کرنا اُن کا اولین مقصد ہے۔ یوگی جی نے ریاست کی کمان سنبھالتے ہی تمام قانونی اور غیر قانونی بوچڑ خانے (سلاٹر ہاؤس) بند کروادئے۔''اینٹی رومیوا سکواڈ'' بنا کر خواتین کی آزادی چھین لی، گلی محلوں سے لے کر بی جے پی کے اراکین پارلیمان میں بھی کھلے عام مسلمانوں کو گالیاں دینے لگے۔ بیف پر پابندی عائد کر کے ہزاروں مسلمانوں کے منہ کا نوالہ چھین لیا۔ طلاق ثلاثہ کے حوالے سے مسلم خواتین سے ہمدردی کے نام پر سماج کو تقسیم کرنے والی سیاست کھیلی گئی۔ گئو رکشا کے نام پر الور میں پہلوخان، دادری میں اخلاق احمد کا قتل، بیف کے نام پر آسام اور بندیل کھنڈ میں مسلمانوں پر مظالم ہوئے۔ حال ہی میں ممبئی کے مراٹھی پتر کار سنگھ میں خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے والی متعدد تنظیموں کی مشترکہ پریس کانفرنس میں خواتین نے دوٹوک انداز میں کہا کہ ''مودی ہمارے مسیحا نہیں ہیں'' گجرات سے آنے والی ''پرواز'' نامی تنظیم کی خیر النساء پٹھان نے حکومت کے اس دعویٰ کو غلط ثابت کر دیا کہ ''سب کا ساتھ سب کا وکاس'' ہو رہا ہے۔ انھوں نے گجرات کے مختلف علاقوں کی مثال دی جہاں بنیادی سہولت تک میسّر نہیں اور مسلمانوں کے ساتھ واضح امتیاز دیکھا جا سکتا ہے۔

معروف وکیل فالی نریمن نے خبر دار کیا ہے کہ ہندوستان کے جمہوری نظام کو بچانے کے لیے ہم عدالتوں پر انحصار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ہندوستان کو ایک مذہبی ملک بننے سے بچانے کی پوری ذمہ داری سول سوسائٹی کی ہے۔ وادئ کشمیر میں گزشتہ سال برہان احمد وانی کی موت کے بعد معمولات زندگی درہم برہم ہیں۔ محبوبہ مفتی مرکز سے مسلسل رابطہ کے باوجود حالات کو سنبھالنے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ ان حالات میں ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو کشمیر کو ٹیرر (Terror) نہیں بلکہ ٹوریزم ضرورت ہے کی بات سمجھا سکے۔ اس بات میں شک نہیں کہ وہاں کے عوام کا مفاد ہندوستان سے وابستہ رہنے میں ہی ہے۔ ایک اور پریشان کن معاملہ ہندی زبان سے متعلق ہے جو ریاستی وفاقی وزیر برائے داخلی امور کرن اجیجو نے اٹھایا ہے۔ حال ہی میں ڈی۔ ایم کے کے لیڈر ایم کے اسٹالین نے مرکزی حکومت پر الزام لگایا ہے کہ وہ ہندی میں بات نہ کرنے والوں کو دوسرے درجہ کا شہری قرار دیتے ہیں اور ''انڈیا'' کو ''ہنڈیا'' بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ پارلیمانی کمیٹی نے صدر جمہوریہ کو سرکاری زبانوں سے متعلق جو سفارش کی تھی جس کی رو سے بشمول صدر جمہوریہ اور تمام وزراء اپنے بیانات اور تقریریں صرف ہندی ہی میں دیں۔ یہ بھی خبر آئی ہے کہ صدر جمہوریہ پرنب مکھر جی نے اس سفارش کو قبول کر لیا ہے۔ نریندر مودی سرکار نے عقبی دروازے سے ہندی کو مسلط کرنے کے لیے یہ سرکولر جاری کیا ہے کہ سوشل میڈیا پر ہندی استعمال کی جائے۔ لسانی تبدیلی کی اس کوشش پر سب چپ کیوں ہیں؟ بولیں گے بھی تو کیا؟ سب وعدوں کی بھول بھلیوں میں کھو گئے۔ اگر ریڈیو کا پرانا گیتوں کا پروگرام ''بنا کا گیت مالا'' جاری ہوتا تو ۲۰۱۹ء تک پہلی پائیدان پر یہی گیت ہوتا:

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا۔ تمام رات قیامت کا انتظار کیا

(اب اس میں تھوڑی تبدیلی کے ساتھ ''تمام رات الیکشن کا انتظار کیا'')

تو جناب ۲۰۱۹ء کا انتظار کیجئے یا ممکن ہے ضمنی چناؤ ہی آجائیں۔ مصیبت کبھی دستک دے کر نہیں آتی۔ اس لیے انتظار اور ابھی، اور ابھی

نہیں پالا پڑا قاتل تجھے ہم سخت جانوں سے

محاذِ ثانی

سید نفیس دسنوی

صنفِ غزل اور اس کے فنی لوازمات

اردو شاعری میں غزل کو جو مقبولیت حاصل ہے اس کی نظیر دیگر اصناف میں نہیں ملتی۔ غزل اردو شاعری کی آبرو کہلاتی ہے۔ اسے بتِ ہزار شیوہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے رنگ ہزاروں ہیں اور اس کے شیدائیوں کی بھی کمی نہیں۔ آج جسے دیکھیے وہ زلفِ غزل کا اسیر نظر آتا ہے۔ یوں تو غزل گو شعرا کی تعداد اچھی خاصی ہے مگر ان میں چند ہی خوش نصیب ہیں جن کو انفرادیت حاصل ہے۔ یہ انفرادیت انھیں یوں ہی حاصل نہیں ہوئی۔ برسوں کی مشق و مزاولت کے ساتھ ساتھ شعری لوازمات کا درک بھی وہ رکھتے ہیں۔ شاعری خاص کر غزل کے لیے عروضی اور فنی معلومات لازمی ہے۔ پوری نہیں تو تھوڑی بہت معلومات سے بھی فائدہ مل سکتا ہے۔

آج کی نئی نسل جو شاعری کر رہی ہے اسے اس لیے درجۂ اعتبار نہیں مل سکتا کہ اس میں فنی خامیاں رہ جاتی ہیں۔ وجہ ظاہر ہے نئی نسل کے بیشتر شعرا کسی استاد سے رجوع کیے بغیر اپنے وجدان کو رہبر مان کر شاعری کر رہے ہیں۔ ان کے یہاں عام طور پر جو خامیاں پائی جاتی ہیں ان میں کچھ کے نام ہیں: ایطا، تقابلِ ردیفن، تعقیدِ لفظی، صوتی تنافر، شتر گربہ ضمائر، شتر گربۂ زمانی، شکستِ ناروا، وغیرہ وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ نئی پیڑھی کے بیشتر شعرا نے ان خامیوں کا نام تک نہیں سنا ہوگا۔ اگر وہ ان سے بے نیازانہ گزریں گے تو شاعری میں کوئی مقام بنا نہیں پائیں گے۔ جب تک استادی شاگردی کا سلسلہ چلتا رہا شعرا فنی لوازمات سے آگاہ رہے اور اب انتشار ہی انتشار ہے۔ ان خامیوں کا تذکرہ میں نے اس لئے کیا کہ بعض حضرات ان جکڑ بندیوں کو پسند نہیں کرتے۔ عروج جونپوری تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ''ایطا کی شدید پابندی اردو شعر و سخن کو برباد کرنے کی سازش ہے''۔ بہر حال یہاں ایک مثال ایطا کی پیش کی جاتی ہے۔ ایطا کا عیب مطلع میں ہوتا ہے۔ گوہر شیخ پوری کا ایک مطلع ہے۔

پیار کا دیپ زمانے میں جلائیں ہم لوگ۔ اور نفرت کے اندھیروں کو مٹائیں ہم لوگ

اس میں قافیہ جلا اور مٹا ہے۔ دونوں سے حرف روی ''الف'' نکال دیں تو باقی جل اور مٹ بچتے ہیں جو بامعنی ہیں اور ہم قافیہ نہیں۔ اس لئے اس مطلع میں ایطا کا عیب ہے۔ اگر باقی بچے دونوں الفاظ ہم قافیہ ہوتے تو ایطا وارد نہیں ہوتا۔ یہ تو تھی ایطا کی تعریف لیکن ہمارے اساتذہ میں خواجہ میر درد، مولانا حسرت موہانی، جلیل مانک پوری، فضا ابن فیضی وغیرہ ایسے قافیوں کو جائز سمجھتے تھے اور ایطا تسلیم نہیں کرتے تھے۔ آج بھی رسائل میں چھپی کچھ غزلوں میں یہ عیب نظر آتا ہے۔ ان اساتذہ کے برعکس دیگر اساتذہ مگر اسے ایک عیب سمجھتے ہیں اور اس سے پرہیز کی ہدایت دیتے ہیں۔ ایطا کے متعلق دو متضاد رایوں سے عام شعرا کے ذہن میں شبہات کا پیدا ہونا فطری بات ہے۔

چنانچہ اہلِ نقد حضرات سے گزارش ہے کہ ایطا کے تعلق سے دیے گیے مندرجہ سوالات کے جواب سے نوازیں تاکہ پتہ چل سکے کہ ایطا ایک عیب ہے یا نہیں:

(۱) آپ کی نظر میں ایطا کی اہمیت؟ (۲) ایطا کا عیب صرف مطلع کے لیے کیوں مخصوص ہے، پوری غزل کے لیے کیوں نہیں؟ (۳) ایطا کی پابندی کیا بڑی شاعری کی راہ میں مانع نہیں ہوتی؟ (۴) ایطا کو جلی اور خفی میں تقسیم کرنا چور دروازے کے برابر ہے۔ (۵) ایطا کے اختلافی پہلوؤں کا کوئی حل آپ کی نظر میں؟

اس بار کٹیہار (بہار) کے ایک جواں فکر شاعر سبطین پروانہؔ کا گوشہ پیش کیا جا رہا ہے۔ شاعری کی دنیا میں ابھی چند برسوں قبل ہی انھوں نے اپنے سفر کا آغاز کیا ہے لیکن شاعری کا رچا بسا ذوق رکھتے ہیں اور زود گو بھی واقع ہوئے ہیں۔ اس قلیل عرصے میں انھوں نے اچھا خاصا شعری اثاثہ جمع کر لیا ہے اور جلد ہی ان کا مجموعۂ کلام ''دردِ نہاں'' کے نام سے منظرِ عام پر آنے والا ہے۔ چونکہ ان کا ابتدائی سفر ہے اس لیے ان کے کلام میں پختگی یا گہرائی و گیرائی کی تلاش قبل از وقت ہوگی۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اب تک کی کوشش لائقِ تحسین رہی ہے جس کا اعتراف فاضل مضمون نگاروں نے کھلے دل سے کیا ہے۔ ادارہ ان سبھی اہلِ قلم حضرات کا شکر گزار ہے جنھوں نے اپنی گرانقدر نگارشات سے گوشۂ سبطین پروانہؔ کی تزئین کی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی وہ اپنا قلمی تعاون دیتے رہیں گے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ مطالعہ کے بعد سبطین پروانہ کو اپنی رائے اور مشوروں سے نوازیں۔

☆☆☆

حمد و نعت

ڈاکٹر محبوب راہی

ڈاکخانہ، بارشی ٹاکلی، ضلع، اکولہ، 444401

بھنور کی زد سے سفینے نکال دیتا ہے
وہ دفعتاً ہر اک آفت کو ٹال دیتا ہے
وہ بے کمالوں کو کیا کیا کمال دیتا ہے
جو مانگتا ہے شہِ ذوالجلال دیتا ہے
جلال دیتا ہے شعلوں سے آفتاب کا وہ
تو ماہتاب کو حسن و جمال دیتا ہے
کسی کو در سے کبھی اپنے ٹالتا ہی نہیں
وہ ہر سوالی کو حسبِ سوال دیتا ہے
مثال اس کی کریں پیش کوئی ناممکن
کہ جو بھی دیتا ہے وہ بے مثال دیتا ہے
کنول کو دیتا ہے قدرت سے اپنی رنگ و جمال
پھر اس کے بعد اسے کیچڑ میں ڈال دیتا ہے
اسے ہے علم سبھی کی طلب کا اے راہیؔ
جسے بھی دیتا ہے وہ حسب حال دیتا ہے

غلام مرتضیٰ راہیؔ

۱۳۵ رپنی۔ فتح پور۔212601 (یوپی)

موبائل۔09236590822

نارسائی کو مری تو کسی قابل کر دے
اک نئے موڑ پہ قائم مری منزل کر دے
سفر ایسا ہو کہ سایہ بھی میسر ہو اگر
راستے میں کہیں رکنا مرا مشکل کر دے
جو مئی جون کی گرمی میں بہاتا ہے کسان
اس پسینے کو مرے خون میں شامل کر دے
کب سے آنکھوں میں ترا خواب لیے بیٹھا ہوں
اک ذرا ارض و سما سے مجھے غافل کر دے
جو مرے واسطے دشوار نظر آتا ہو
مجھ کو ایسے ہی کسی کام کے قابل کر دے

محمد باعشن مغموم (کولکاتا)

Mob-9830355610

تری زمین، تیرا چمن، آسماں ترا
مشتاقِ دید آنکھ تو ہر دل مکاں ترا
کیا کیا کرے گا وصف قلم یہ بیاں ترا

تجھ سے ہے زندہ تجھ سے ہے گردش میں یہ حیات
سر چشمۂ حیات ہے تو ربِّ کائنات

چشمہ ہے تو حیات کا تخلیق کا سرور
کب کوئی معجزہ ہے تری دسترس سے دور
غرقابِ نیل ہو گیا فرعون کا غرور

واضح کئے جہان پہ عظمت کے سب نکات
سر چشمۂ حیات ہے تو ربِّ کائنات

تیری رضا نہ ہو تو بنے پھول کیا کلی؟
تیری رضا سے لب پہ سجے دھوپ سی ہنسی
تیری رضا سے ہی تو ہے آنکھوں کی روشنی

اچھا ہو یا بُرا ہو یہاں سب میں تیرے ہات
سر چشمۂ حیات ہے تو ربِّ کائنات

ظلم و ستم کا خوف ہے ہر دل میں جان میں
محفوظ اب نہیں کوئی اپنے مکان میں
پانی سے سستا خون ہے یارب! جہان میں

ہے خون خون، نیل ہو دجلہ ہو یا فرات
سر چشمۂ حیات ہے تو ربِّ کائنات

ہم سب بھٹک گئے ہیں ہمیں راستہ دکھا
انسان دوستی کا سبق ہم کو پھر پڑھا
انسانیت کے کشتہ چراغوں کو پھر جلا

دھرتی کی کوکھ سے تو اُگا قند اور نبات
سر چشمۂ حیات ہے تو ربِّ کائنات

عبرت مچھلی شہری

Mohalla Khanzada..P.O:Machhli Shaher

محمدؐ کہہ کے جب ان کو خدا آواز دیتا ہے
فضیلت بولتی ہے مرتبہ آواز دیتا ہے
مکمل بولتی تصویر ہے تو آدمیت کی
ترے کردار کا ہر زاویہ آواز دیتا ہے
سوالِ آخرت پہ فکر کے سب راستے چپ ہیں
فقط اک مصطفیٰ کا راستہ آواز دیتا ہے
یہ کیسی خود فریبی ہے کہ سن کر بھی نہیں سنتے
''ہمیں دینِ محمد مصطفیٰ آواز دیتا ہے''
کوئی صدیقؓ لکھ کر جب وفا لکھتا ہے کاغذ پر
زباں بن کر ہر اک حرفِ وفا آواز دیتا ہے
جہاں تھک کر قلم خاموش ہو جاتا ہے منصف کا
وہاں میرے عمرؓ کا فیصلہ آواز دیتا ہے
اک اک قطرہ اب اس کا طالبِ انصاف ہے تجھ سے
غنیؓ کا خون تجھ کو یا خدا آواز دیتا ہے
بھیانک موت کا سناٹا چھا جاتا ہے میداں پر
گرج کر رَن میں جب شیرِ خدا آواز دیتا ہے
کدھر جاؤں اُدھر مجھ کو بلاتی ہے قضا عبرتؔ
اِدھر مجھ کو حبیبِ کبریا آواز دیتا ہے

دو شعر

خیر مقدم کے لیے ان کے سرِ راہ گزر
خود ہوا آ کے چراغوں کو جلا دیتی ہے

☆

ہے بادباں پہ لکھا کلمۂ رسول اللہ
مرے سفینے کو طوفاں سلام کرتے ہیں

☆

سعید رحمانی

حمد و نعت

سمیع الحق شاکر
سوتاہاٹ۔کٹک۔ا

یہی ہے مری التجا میرے مولا
مجھے پھر مدینہ بلا میرے مولا
مجھے رکھ ہمیشہ پناہوں میں اپنی
گناہوں سے مجھ کو بچا میرے مولا
نہ تکلیف دوں میں کبھی بھی کسی کو
ہمیشہ تو حق پر چلا میرے مولا
نمازیں ادا ہوں میری با جماعت
کبھی ہوں نہ مجھ سے قضا میرے مولا
کرم ہی کرم ہے تیرا مجھ پہ آقا
تو شاکرؔ کی بگڑی بنا میرے مولا

جمیل فاطمی
مقام وڈاکخانہ لکھمنیا۔ضلع بیگوسرائے۔۸۵۱۲۱۱

حسن سراپا نور کے پیکر صلی اللہ علیہ وسلم
چاند سے روشن عارضِ انور صلی اللہ علیہ وسلم
چھٹ گئی یکسر ظلمتِ باطل، ہوگئی ساری دنیا روشن
جب وہ آئے قرآں لے کر صلی اللہ علیہ وسلم
مسجدِ نبوی، شہرِ مدینہ، مرجعِ خلائق سینہ بہ سینہ
آنکھوں کی ٹھنڈک روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم
اپنی اپنی قسمت لے کر آتے ہیں کن کن ملکوں سے
شاہ وگدا سب آپ کے در پر صلی اللہ علیہ وسلم
عرشِ بریں پہ آپ کا جانا، جا کر خدا سے باتیں کرنا
کس کو ہے یہ رُتبہ میسّر صلی اللہ علیہ وسلم
کھانا پینا، جاگنا سونا سب میں مضمر مرضئ مولا
اُسوۂ حسنہ اللہ اکبر صلی اللہ علیہ وسلم
میرے آقا سرورِ عالم، شافعِ محشر خُلقِ مجسّم
سب سے ہیں افضل، سب سے برتر صلی اللہ علیہ وسلم

(الحاج)حمید عکسی
H.No:14-6-39,Nizampura
Dt:Warangal-506002(T.S)

نعت خوانی مِرے حضورؐ کی ہے
مہربانی مرے حضورؐ کی ہے
دونوں عالم میں آج تک لوگو
حکمرانی مِرے حضورؐ کی ہے
داغ جو ہے قمر کے ماتھے پر
یہ نشانی مِرے حضورؐ کی ہے
کوئی جھٹلا نہ پایا اس کو بھی
حق بیانی مِرے حضورؐ کی ہے
مثلِ شمعِ ہدیٰ قیامت تک
زندگانی مِرے حضورؐ کی ہے
دونوں عالم پہ ہر گھڑی عکسیؔ
کامرانی مِرے حضورؐ کی ہے

حفیظ فاروقی
مکان نمبر۔1.413.6اشوک نگر۔کریم نگر۔ا

ہدایت میں قیادت میں محمدؐ ہی محمدؐ ہیں
بشارت میں سفارت میں محمدؐ ہی محمدؐ ہیں
مئے وحدت سے سرشاری اصولوں سے نہیں عاری
شریعت میں طریقت میں محمدؐ ہی محمدؐ ہیں
شبِ ہجرت اطاعت ہی علی کی خود حفاظت ہے
کہ ہجرت میں ضمانت میں محمدؐ ہی محمدؐ ہیں
نہیں تدبیر سے خالی، بجا وہ صلح ہو کوئی
شجاعت میں، فراست میں محمدؐ ہی محمدؐ ہیں
مقام ان کا خدا جانے مگر یہ بھی حقیقت ہے
یہ خلوت میں، وہ جلوت میں محمدؐ ہی محمدؐ ہیں
کمالِ ذاتِ باری ہے نبوت ایک اُمّی کی
فصاحت میں بلاغت میں محمدؐ ہی محمدؐ ہیں
حفیظؔ ناتواں تجھ سے خدا خوش ہو ہی جایے گا
کفایت میں، معیت میں محمدؐ ہی محمدؐ ہیں

شہیدِ اعظم حضرت امام حسینؑ
محمد نوشاد نورنگ (اندور)

ہم اہلِ حق ہیں ہم کو محبت حسین سے
ان سے ملی ہے دین پہ لُٹنے کی اک ادا
باطل سدا رہے گا جہاں میں ذلیل و خوار
دنیا میں بھیجی جائے گی لعنت یزید پر
ہو گا وہ سُرخرو جو ہے حامئ شہید
دوزخ کی آگ منتظرِ آمدِ شقی
جو رہ نہیں حسینؑ، وہ کافر کی رہ گزر
کیا بات ان کی جن کے ہیں نانا شہہ جہاں
اللہ کی نظر میں بھی شبیر ہیں عظیم
مٹ جاتا ہے یزید مٹانے میں دین کو
اسلام ہے حسین کا، اسلام کے حسین
نانا نبیؐ کی جان ہیں حضرت علیؓ کی شان

نسبت حسین سے ہے عقیدت حسین سے
زندہ رہا کرے گی شہادت حسین سے
قائم رہے گی حق کی روایت حسین سے
مومن کی ہو گی دہر میں حُرمت حسین سے
مٹ جائے جو کرے گا عداوت حسین سے
جنت کی اہلِ دیں کو ضمانت حسین سے
محشر تلک رہے گی شریعت حسین سے
اسلام کی ہے دنیا میں سطوت حسین سے
اسلام کی جہان میں عظمت حسین سے
باقی رہے گی دنیا میں ملت حسین سے
اسلام آج زندہ ہے حضرت حسین سے
نورنگؔ مومنوں کی ہے عزت حسین سے

گوشۂ احباب

(مراسلہ نگار سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں)

☆جمیل فاطمی (بیگوسرائے، بہار)

اس شمارے میں آپ نے ڈاکٹر فریاد آذر کا گوشہ شائع کیا ہے۔اس کے مطالعہ سے دل خوش ہوا۔ڈاکٹر فریاد آذر بے شک منفرد لب ولہجہ کے ایک کامیاب شاعر ہیں۔اُن کے بارے میں پڑھ کر اچھی جان کاری ہوئی۔ایک سے بڑھ کر ایک جُغادری مضمون نگار نے اُن کے ایک ایک گوشے پر قلم اُٹھایا ہے اور حق ادا کر دیا ہے۔میری جانب سے تمام مضمون نگار حضرات کو بھی مبارک باد اور اتنا اچھا گوشہ نکالنے پر آپ حضرات بھی مبارک باد قبول فرمائیں۔جناب سید نفیس دسنوی بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں اُنھیں بھی مبارک باد۔اس کے علاوہ دوسرے مضامین بھی علمی اور معیاری ہیں۔جناب استاذی حضرت ناوکؔ حمزہ پوری کی رباعیاں بھی بے حد عمدہ ہیں۔جناب ظہیر غازی پوری کی آخری غزل بھی پڑھی اور محظوظ ہوا۔اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔موصوف بڑے مخلص اور معیاری شاعر تھے۔رسالہ قاعدے سے ملتا ہے۔(شکریہ)

☆شارق عدیل (ایٹہ۔یوپی)

ادبی محاذ وقت کی پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اردو زبان وادب کے قارئین کے مطالعہ کی پیاس مسلسل بجھا رہا ہے جو اس وقت کسی معجزے سے کم نہیں۔

آنکھوں میں تیرتی ہے مسرت کی روشنی

دل خوش بہت ہے گوشۂ آزر کو دیکھ کر (شارق عدیل)

گوشۂ آزر کا مطالعہ کرتے ہوئے غزل سے متعلق بہت سی باتیں ذہن میں ابھر کر اس طرح گڈ مڈ ہو گئی ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کر کے تحریر کرنے کے لئے متعدد صفحات کی ضرورت پڑے گی جس کا یہاں موقع نہیں ہے۔لیکن اتنا تو لکھا ہی جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر فریاد آزر کی شاعری حقانی القاسمی، پروفیسر ابنِ کنول، ڈاکٹر کوثر مظہری، پروفیسر مولا بخش، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر ممتاز الحق اور سعید رحمانی کے مضامین میں اپنی معنوی جہات کے جاہ وجلال کو بیان کرتے ہوئے ناقدین کی شعر فہمی کو مزید بیدار کر دیتی ہے۔کیونکہ ان کی شاعری اپنے اسلوب کے حصار میں رہ کر موضوعات کے ایسے حسین ترین پیراہن اختیار کرتی جا رہی ہے کہ صدیوں پرانی غزل بھی بالکل نئی نئی سی نظر آ رہی ہے۔

ہوا کے حکم کی تعمیل ہونے والی ہے

گلِ احتجاج کی قندیل ہونے والی ہے

اس شعر میں ہوا، احتجاج، قندیل، ایسے عام فہم الفاظ نے مل کر جو معنویت کا خاکہ کھینچا ہے اس میں ہندوستان میں بدلتی ہوئی سیاست کا دیدار کیا جا سکتا ہے۔اگر ناقدین پل پل بدلتی ہوئی اس عہد کی فطرت کو سامنے رکھ کر نئی غزل کا مطالعہ کریں گے تو اور بھی کئی شاعر نئی غزل کے حوالے سے اپنے ہونے کا ثبوت مہیا کرا دیں گے۔

غزل کو میرؔ کی آنکھوں سے دیکھنے والو

ہمارے عہد کے اپنے بھی کچھ تقاضے ہیں (شارق عدیل)

☆طاہر حسین طاہرؔ (ناڈیز)

جنوری تا مارچ ادبی محاذ، گوشہ ڈاکٹر فریاد آزرؔ ہمدست ہوا شکریہ۔اس میں میری طرحی اور غیر طرحی دو غزلوں کی شمولیت میرے لئے باعث فخر ومسرت ہے۔اس نوازش کے لئے میں آپ کا بے حد ممنون ومشکور ہوں۔انشاء اللہ زرِ سالانہ اگلے ماہ منی آرڈر کر دوں گا۔آپ اطمینان رکھیں۔جنوری تا مارچ کے ادبی محاذ کی مشمولات لائق ستائش ہیں، بالخصوص ظہیر غازی پوری کی رباعی گوئی پر علیم صباؔ نویدی صاحب کا مضمون، ڈاکٹر فریاد آزر کی تمام غزلیں' حضرت ناوکؔ حمزہ پوری صاحب کی رعبایات، گوہر شیخ پوروی صاحب، مسلم نواز صاحب، بدر محمدی صاحب، حافظ کرناٹکی صاحب کی غزلیں بے حد پسند آئیں۔علاوہ ازیں اپنی کہی گئی غزل ارسال خدمت کر رہا ہوں۔انشاء اللہ پسند آئے گی۔

☆روی سنگھ رانا شاہین (ایڈوکیٹ)۔ہماچل پردیش

آپ دونوں حضرات، آپ کے اہل خانہ اور ادبی محاذ سے منسلک دیگر افراد کو نیا سال بہت مبارک ہو۔آپ نے اچھا کیا جو ۲۰۱۷ء کا نیا شمارہ مجھے ارسال کر دیا۔میں بہت مشکور ہوں۔ویسے بھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ آپ کو خط لکھ کر نئے سال کے لئے نیک خواہشات کا اظہار بھی کروں اور زرِ سالانہ بھی بھیجوں۔آپ کے رسالے کو میں اُردو قارئین کے لئے اس لئے بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ واحد رسالہ ہے جو ہمیں مشرقی ہندوستان اُردو ادب اور ادیبوں سے متعارف کراتا ہے۔ہندوستان کے اُردو ادب کے حق میں یہ آپ کی بہت بڑی خدمت ہے جس کے لئے مجھ جیسے قارئین آپ کے اور آپ کے ادارے کے بہت مشکور ہیں۔اپنے پچھلے شماروں میں (جو مجھے دستیاب ہوئے) آپ نے اُردو ادب کے ایسے ایسے خدمت گاروں کو متعارف کرایا ہے جن کے بارے میں مجھ جیسے قاری قطعی انجان تھے۔تازہ شمارہ بھی جناب فریاد آزرؔ صاحب پر مرکوز ہے جن سے متعارف ہونے کا شرف ادبی محاذ نے بخشا۔ڈاکٹر فریاد صاحب کا سوانحی پس منظر پڑھتے ہوئے ان کا درج ذیل شعر مجھے بے حد پسند آیا:

ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں۔ خوبصورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

مجھے یہ شعر اتنا اچھا لگا کہ اسے میں نے دو درجن سے بھی زائد دوستوں کو سنایا۔ وہ بھی اس شعر کی تعریف کئے بنا نہ رہ سکے۔ یہ شعر ہمارے معاشرے کی موجودہ ترجیحات کی عکاسی کرتا ہے۔

آپ کے اداریے بعنوان ''اپنی بات'' سے پتہ چلا کہ آپ کا رسالہ تیرہویں سال میں داخل ہو گیا ہے۔ آپ کو اور آپ کے دیگر کارکنان کو اس بات کے لئے بہت مبارک باد۔ ہماری دعا ہے کہ ادبی محاذ سالوں سال اُردو و ادب کی خدمت کرتا رہے۔ آمین

☆یعقوب بدایونی (بجنور)

چارہ گر جم گیے کچھ قطرے لہو کے دل پر

جس کو ناسور تو سمجھا ہے وہ ناسور نہیں (یعقوب بدایونی)

بچپن کا وہ زمانہ یاد آتا ہے جب مولانا ماجد دریا آبادی کا ہفت روزہ ''صدقِ جدید'' ایک ہفتہ تک ماہیٔ بیقرار رکھتا تھا۔ اب بڑھاپے میں سہ ماہی ''ادبی محاذ'' تین مہینے تک تڑپاتا ہے۔

اس وقت نسیمِ سحری میں گوشۂ غلام سرور ہاشمی پر شمارہ زیرِ نظر ہے۔ ادبی محاذ کے انتظار کی گھڑیاں سوہانِ روح ضرور تھیں لیکن شمارہ ملتے ہی سکونِ قلب حاصل ہوا۔ اس میں کیا کچھ نہیں ہے۔ زمانے کی دھڑکنیں ہیں، وقت کی نبض پر نظر ہے، دوستوں کی دلجوئی ہے، ادبی عاشقوں کی چاشنی ہے، نفیس و معتبر دوستوں سے گفتگو ہے۔ غزلیات پروقار ہیں جن میں محترم اختر شاہجہانپوری کی چھوٹی بحر کی غزل ادبی لطافت کے ساتھ معنی خیز بھی ہے۔ پورے ادبی ماحول کی غمازی کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

جنوں ہے یا اسے پاسِ انا ہے۔ خلوصِ بے نہایت سے خفا ہے

اس پردۂ زنگاری میں کون ہے، اہلِ شاہجہان پور جانتے ہوں گے۔ ''خلوصِ بے نہایت'' کی نئی ترکیب نے مجھے تڑپایا ہے کیونکہ میں اس کرب و اذیت سے خوب آشنا ہوں۔ قمر صاحب کی پوری غزل ادبی زندگی کی روشن عکاسی کرتی ہے۔ میری طرف سے دلی مبارکباد۔ اے اللہ!

یہاں تجدیدیت سر اٹھانے لگی ہے۔ ہمیں اس کے شر سے بچا دیجئے نا

علاوہ ازیں گوشۂ غلام سرور ہاشمی پر مضامین گونا گوں حیثیت سے جناب ہاشمی صاحب کی جواں عمری کو دیکھتے ہوئے جہاں ان کی ادبی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں وہیں ان کے تابناک مستقبل کا پتہ بھی دیتے ہیں۔ غلام سرور ہاشمی پر عبدالمتین جامی کا مضمون ہرچہ بقامت کہتر بقیمت بہتر کے مصداق ہے۔ جناب سعید رحمانی اپنے مضمون میں غلام سرور کی فکری اڑان کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ پروفیسر عشرت آرا سلطانہ کا مضمون ''کھردرے ہاتھ'' خوب ہے اور فلسفیانہ نظریئے سے معاشرے کی حسین عکاسی کرتا ہے۔ انجینئر عادل فراز صاحب نے وفا نقوی کے کلام میں سائنس کے بیش بہا نکتہ جات تلاش کیے ہیں جو علم کیمیا اور نسخۂ کیمیا سے کم نہیں۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ ادب نواز لوگوں کے لیے ایک بیش قیمت ادبی سوغات ہے۔

☆عبدالحی پیام انصاری (گورکھپور)

ادبی محاذ برائے اپریل تا جون کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ قاضی مشتاق احمد صاحب کی فکر میں شریک ہوتے ہوئے یہ عرض کرنا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم خوابِ غفلت سے بیدار ہوں۔ ۷۰ رسال سے سیکولر حکومتوں نے بھی نرم ہندوواد کے اصولوں پر چلتے ہوئے مسلمانوں کو صرف ووٹ بینک ہی سمجھا اور آر ایس ایس سیکولر حکومتوں پر تشٹی کرن کا الزام لگاتی رہی۔ ہمیں اب پوری طاقت اور صلاحیت سے خود کو علمی، اقتصادی، معاشی اور سماجی طور پر مستحکم کرنے میں صرف کرنی چاہیے۔ بچوں کو چاہے گھروں میں چاہے مدرسوں میں ایسی تعلیم دینے کی ضرورت ہے جو انھیں صراطِ مستقیم پر چلنے کے ساتھ عصری تقاضوں کا سامنا کرنے کے قابل بنا سکے اور ان پر آر ایس ایس کے ناپاک منصوبوں کا اثر نہ ہو:۔

بیٹھے ہیں ہر بزم میں لیکن۔ جھاڑ کے اپنا دامن اٹھیں

باقی مضامین، غزلیں اور افسانے زمانے کے ساتھ قدم ملانے والے ہیں۔ گوشۂ غلام رسول ہاشمی حوصلہ افزا ہے۔ میری غزل شامل کرنے کے لیے ممنون ہوں۔

☆ضیا جعفر (بنگلور)

اپریل تا جون کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ محاذِ اول کے تحت قاضی مشتاق احمد صاحب نے حقیقت پر مبنی بات کہی ہے: ''ان کے ہزاروں دیوی دیوتا ہیں لیکن انھیں آپس میں اتحاد قائم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا ایک ہی خدا اور ایک ہی قرآن ہے اور سبھی ایک ہی کلمہ پڑھتے ہیں لیکن انھیں ایک ہونے کی توفیق ابھی تک نصیب نہ ہو سکی''۔

گوشۂ غلام رسول ہاشمی میں مختلف قلمکاروں نے اپنے اپنے انداز سے ان کے فن کو سراہا ہے اور واقعی شاعری کا ہنر وہ خوب جانتے ہیں۔ تبھی تو یہ شعر ان کے قلم سے نکلا ہے:۔

جو مشہور کر دے مجھے اس جہاں میں۔ میں اپنے لیے وہ ہنر چاہتا ہوں

رؤف خوشتر صاحب نے وقار احمد کی اردو خدمات کا احاطہ بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ حنیف سید کا افسانہ مجروح جذبات کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔ میرا افسانہ ''ٹھنڈی آگ'' کو بھی لوگوں نے بہت پسند کیا۔ عبدالمتین جامی کا ترجمہ شدہ افسانہ ''دو سو روپے'' طنز کی کاٹ رکھتا ہے۔ ایڈوکیٹ حبیب ریتھ پوری کا افسانہ بھی اچھا لگا جبکہ ایس۔ کیو عالم طلعت کا افسانہ ''قربانی'' محبت کے ایک نئے انداز سے روشناس کراتا ہے۔ اقبال سلیم صاحب کا افسانہ ''دلوں کے داغ چھپاؤ'' میں ممتا کا پاکیزہ چہرہ نظر آیا۔ قارئین سے درخواست ہے کہ میری صحت کے لیے دعا فرمائیں۔

☆ڈاکٹر قمر گوالیاری (گوالیار، ایم۔ پی) ادبی دستاویز ''ادبی محاذ'' برائے اپریل تا

جون ۲۰۱۷ء موصول ہوا۔مضمون ''ہمارے سماجی ٹھیکہ دار کیا کر رہے ہیں؟''اس موضوع پر قاضی مشتاق احمد صاحب کی طائرانہ نظر کارگر ہے۔ہاں بھگوا لفظ کو زعفرانی لکھنا یا بولنا نہیں چاہیے۔بھگوا عام فہم لفظ ہے جو اصل روپ میں ہی اردو میں لکھا اور بولا جانا چاہیے۔مدیر نفیس دسنوی صاحب نے اداریہ ''حرفِ گفتنی'' میں ہمارے متحد نہ ہونے کے مسئلہ پر بڑی خوبی کے ساتھ لکھتے ہوئے علامہ اقبال کا شعر پیش کیا ہے جو ضروری تھا اور غور طلب ہے:

ایک ہے اپنا خدا اور ہے قرآن بھی ایک۔کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

ادبی محاذ میں نثری وشعری مشمولات کامیاب ہیں۔فن اور شخصیت پر بھی معلوماتی مضامین ہیں۔افسانوی حصہ بھی بہت خوب ہے۔اقبال سلیم صاحب کا افسانہ ''دلوں کے داغ چھپاؤ'' میں دلہن جس کا نام دلرس ہے وہ اپنے بچے کو گود میں لیے اپنی ساس کے پاؤں چھونے کے لیے جھکتی ہے۔پاؤں چھونے کے لیے جھکنا مسلم معاشرے میں نہیں ہے۔اسلام میں جھک کر سلام کرنا' مصافحہ کرنا' گلے ملنا' سینے سے لگنا یا لگانا یہ تو ہوتا ہے مگر کسی کے پاؤں چھونا نہیں ہوتا۔

اسی شمارے میں غلام سرور ہاشمی پر گوشے کی اشاعت ایک اچھی بات ہے۔میں اپنی عمر کے چوتھے پہر میں ہوں۔سرور سے عمر میں ۴۸ر برس بڑا ہوں۔میں سرورؔ کے لیے خلوص کے ساتھ لکھ رہا ہوں۔صفحہ ۲۸ر پر ان کی ایک غزل کا ایک شعر ہے:۔

ماں باپ کی عزت کا جنھیں پاس نہیں ہے۔وہ بے ادب ہیں ان کو حیا تک نہیں آتی

ثانی مصرع کا یہ ٹکڑا ''وہ بے ادب ہیں'' بحر سے خارج ہے۔مصرع یوں درست ہوگا:۔

بے دین ہیں وہ ان کو حیا تک نہیں آتی

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:۔

اے دوستو شک کو نہ کبھی دل میں بٹھانا۔شکی کو تو ملنے کی ادا تک نہیں آتی

ثانی مصرع میں شکی لفظ ''شکّی'' ہو رہا ہے جو دونوں روپ میں غلط ہے۔صحیح مصرع اس طرح ہوگا: شک والے کو ملنے کی ادا تک نہیں آتی

(نوٹ۔لغات میں لفظ شکی کا کاف مشدد ہے اور معنی ہے شبہہ کرنے والا۔اگر آپ کے مطابق یہ غلط ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اردو Vocabulary سے ایک لفظ کم کرنا پڑے گا۔کیا ایسا کرنا درست ہوگا؟)

اسی صفحہ پر تیسرے کالم میں ایک غزل کا مطلع ہے:۔

قاتل نہیں ہے کوئی گنہگار نہیں ہے۔اس کو سزا ملی جو خطا کار نہیں ہے

اس غزل کے سبھی اشعار میں ردیف غلط ہے۔ردیف ''نہیں ہے'' بروزن فعلن کے بجائے ''ہے نہیں'' بروزن فاعلن ہونا چاہیے۔جیسے:

قاتل نہیں ہے کوئی گنہگار ہے نہیں۔اس کو سزا ملی جو خطا کار ہے نہیں

اسی غزل کا مقطع ہے:۔

سرورؔ تمہارے ساتھ ہوں گر ماں کی دعائیں۔منزل کو پانا پھر کوئی دشوار نہیں ہے

مقطع کا پہلا مصرع بحر میں نہیں ہے۔دوسرے مصرعے میں ''منزل کو'' کے بجائے ''منزل تو'' زیادہ مناسب ہوگا۔موزوں مقطع یوں ہوگا:۔

سرورؔ تمہارے ساتھ جو ماں کی دعائیں ہوں۔منزل تو پانا پھر کوئی دشوار ہے نہیں

صفحہ ۲۹ر پر منتخب اشعار میں ایک شعر ہے:۔

شہر میں بہتے لہو کی ندیوں کو دیکھ کر۔دل کھنچا جاتا ہے اپنا آج صحرا کی طرف

سرور میاں صحرا کی طرف جانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔تشدد کے خلاف بیداری اور یکجہتی کے جذبے کو لانا ہوگا تاکہ لہو کی ندیاں نہ بہیں۔شعر میں وہ بات ہونا چاہیے جس سے عوام میں اچھے عمل کی طرف آگے بڑھنے کا جوش پیدا ہو۔شعر کا دوسرا مصرع یوں کہنا ہوگا: چشمِ تر میری اٹھی رب العلیٰ کی طرف

یعنی ہم اللہ سے کہہ رہے ہیں کہ تشدد پسندوں کو وہ عقلِ سلیم عطا کرے اور ہمیں فوقیت دے کہ ہم اچھی فضا لا سکیں۔غلام سرور ہاشمی ترقی کی منازل طے کریں۔اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

☆☆☆

ڈاکٹر قمر گوالیاری

NearMasjid.LakkadKhana
Gawalior-474001(M.P)

ہو ترے فن میں کہ جو تھی فنِ آذر میں کشش
پھر ترے ہاتھ سے آجائے گی پتھر میں کشش

آدمیت کی ضیا ماند نہ پڑ جائے کہیں
آب جانے پہ نہیں رہتی ہے گوہر میں کشش

کوئی طوفاں مری کشتی کے تو آگے آئے
دیکھنا تم کہ پھر آئے گی سمندر میں کشش

پھر یزیدوں کے مقابل نہیں سر جھک سکتے
ہم میں آئے وہ کشش جو تھی بہتّر میں کشش

پھر بھی محتاط ہمیں رہنا ہے ایک ایک قدم
رہنما جیسی ہی مانا کہ ہے رہبر میں کشش

کاش! ہٹ پائے تعصب کی دلوں سے وحشت
پھر تو جنت سی نظر آئے گی منظر میں کشش

تنگ دل' تنگ نظر ہوں گے جہاں لوگ قمرؔ

ڈاکٹر علی عباس امیدؔ
Dr.Colony.EidgahHills
Bhopal-462001(M.P)

شب کی موت

بہار نو کی طرح اب پیامِ کیف لئے
جہاں پہ ایک نئی صبح مسکراتی ہے
یہ صبح نو جسے خوابوں کی آبرو کہیے
نہ جانے کتنی ہی تعبیریں ساتھ لاتی ہے

برس رہی ہیں گھٹائیں سرور و الفت کی
دلوں کے پیار کی خوشبو سی ہے ہواؤں میں
ہر ایک چہرہ شگفتہ ہے پھول کے مانند
نشاطِ عید کا جادو سا ہے فضاؤں میں

یقین ہے کہ محبت کے خوش ادا بادل
دلوں کے پیار کی مٹی کو گدگدائیں گے
ہمارے عزمِ جواں سے دلوں کی مٹی میں
حیاتِ نو کے سُبک نخل لہلہائیں گے

شارق عدیل
Marhera.Dist:Etah-207401
Mob-9368747886

دوبیتیاں

ذات سے اپنی میں محروم ہوا جاتا ہوں
یوں ترے عشق میں مظلوم ہوا جاتا ہوں
زندگی حال پہ بھی اتنا کرم مت فرما
میں کہ آزاد تھا محکوم ہوا جاتا ہوں

☆

ہمک رہی ہے لہو میں محبتوں کی کسک
سجا رہا ہوں میں تنہائیوں سے دل اپنا
ابھی اُمید سے پُرساعتوں کا موسم ہے
چلے بھی آؤ یہاں چاہتوں کا موسم ہے

☆

آ کر کبھی یہ حال ہمارا کوئی دیکھے
آہوں بھرا ماحول چمکتا ہے سحر سا
ہر گوشہ شبِ غم کا دمکتا ہے سحر سا
اشکوں کی کرامت کا نظارہ کوئی دیکھے

☆

تم نے تو ظلمتوں کے سہارے دیے فقط
ہر گام ہولناک نظارے دیے فقط
منظر سیاہیوں کے بدلتے تو بات تھی
سورج کی مثل گھر سے نکلتے تو بات تھی

ڈاکٹر مقصود احمد انصاری (ایڈوکیٹ)
مسکن درگاہ، منصور چک، بیگوسرائے
بچھوارا، بہار۔85112 8

درد کا رشتہ

زندگی کا
پرتو
میری "تہذیب"
ہے
روحِ احساس
تجھ سے
قریب
دل کے پردے پر
حکومت کرتے ہیں
تیری
یاد کے سائے
آ بھی جا
"درد کا رشتہ"
جاگ رہا ہے
قہقہوں کا شہر
منتظر ہے
تیرا
بن نہ جائے
یہ کہیں
اب
ہچکیوں کی
نگری

(الحاج) حمید عکسی
H.No:14-6-39,Nizampura
Dt:Warangal-506002(T.S)

ہے یہ وطن ہمارا

فردوس کی طرح ہے ہندوستاں ہمارا
ہم اس کی باغبانی کرتے ہیں مل کے ہر دم
گودی میں اس کی پل کر ہم بھی جواں ہوئے ہیں
اس کے پہاڑ دریا یا ہوں کہ ریگِ صحرا
دل سے بھلا کے نفرت مل جل کے ہم رہیں سب
ہے زندگی نچھاور اس پر ہماری عکسیؔ

ہر ذرّہ اس کا ہم کو لگتا ہے اِک ستارہ
پھولوں سے ہے مہکتا دل کش چمن ہمارا
ہر غم میں اور خوشی میں دیتا ہے یہ سہارا
ہر سمت ہے نظر میں اِس کا حسیں نظارا
بس پیار ہو دلوں میں پیغام ہے ہمارا
ہے یہ وطن ہمارا ہے یہ وطن ہمارا

ڈاکٹر تبسّم فرحانہ

روڈ نمبر ۷ نیو کریم گنج گیا۔۸۲۳۰۰۱

سسکتی آواز

شاید! ایک خاموش سا اشارہ ہی تھا

جو فجر کی اذان کے ساتھ ہی

بالکل خاموشی سے قضا آئی

اور لے گئی روحِ فرحتؔ کو، بہت ہی اہتمام کے ساتھ

چاندی کی طشتری میں سجائے ہوئے

ان دیکھی فضاؤں میں تحلیل ہوئی

اور دے گئی

ایک بے جان اور بے حس و حرکت جسم کو

موت کی آغوش

دوسرے ہی پل ایک سسکتی ہوئی آواز

دعاؤں کی ہتھیلی میں آسمان تک اٹھائے ہوئے

اشکوں کے شبنمی پھولوں کی خوشبو سے مخاطب

بے اختیار کہہ اٹھی/ جا کہہ دے میرے رب سے

روحِ فرحتؔ کو دعاؤں کی نکہت سے معطر کر دے

ان کی بے قرار روح کو پناہ دے دے/ اس طرح

جس طرح پیدائش کے بعد ایک نوزائدہ بچہ

اپنی ماں کی پناہوں میں آتا ہے

اے میرے دعاؤں کے بادل!

جا، ان کی تربت پر اپنی رحمت کی بارش کر دے

سیراب کر دے تربتِ فرحتؔ

میرے ہونٹوں سے نکلے ہوئے کلمۂ طیب کے پھول!

درود پاک کی روشن پھلجھڑیاں!

میرے صبر کی انتہا! میرے مغموم دل کی سسکتی آواز

کہہ دے میرے رب سے

جو تیری پناہوں میں آیا ہے

جگمگا دے اس کی جنت

بخش دے اس کی خطاؤں کو۔۔۔۔

بخش دے اس کی خطاؤں کو۔۔۔۔۔

فیض رتلامی (ادیب)

48,Samta Nagar(Anand Colony)

تو جج پہ جاؤں گا

اگر ملے گی محبت تو جج پہ جاؤں گا
دلوں سے نکلے گی نفرت تو جج پہ جاؤں گا

جو مجھ میں خوبی ہے وہ صرف اک کہانی ہے
کہانی ہوگی حقیقت تو جج پہ جاؤں گا

ابھی تو میرے اقارب ہی مجھ سے باغی ہیں
یہ چھوڑ دیں گے بغاوت تو جج پہ جاؤں گا

شکایتیں ہیں بہت مجھ سے میرے اپنوں کی
نہ ہو گی ان کو شکایت تو جج پہ جاؤں گا

نہیں کہوں گا میں جب لوگ مجھ سے کہہ دیں گے
بہت ہے مجھ میں شرافت تو جج پہ جاؤں گا

ہزار غم ہیں مرے ساتھ میرے اپنوں کے
غموں سے مل گئی فرصت تو جج پہ جاؤں گا

اصول ہے کہ مروّت نہیں تجارت میں
کروں گا جب میں مروّت تو جج پہ جاؤں گا

ضرورتیں ابھی پوری نہیں ہوئیں میری
نہ ہوگی کوئی ضرورت تو جج پہ جاؤں گا

مصیبتوں کے پہاڑوں پہ فیضؔ چڑھتا ہوں
اُتر گئی جو مصیبت تو جج پہ جاؤں گا

ڈاکٹر مسعود جعفری

Shaikhprt.Hyderabad

Mob-9949574641

تمہارے یہ تین سال

(مودی جی کی سہ سالہ معیاد پر)

بے کار کے فضول تمہارے یہ تین سال
توڑے ہیں سب اصول تمہارے یہ تین سال

چھبتے ہوئے ببول تمہارے یہ تین سال
ہر سو غبار دھول تمہارے یہ تین سال

آفات کا نزول تمہارے یہ تین سال
غمگین اور ملول تمہارے یہ تین سال

ہر موڑ پر حیات کا عرصہ ہوا ہے تنگ
ہم کو نہیں قبول تمہارے یہ تین سال

محسوس ہو رہا ہے کہ صدیاں گذر گئیں
لگنے لگے طویل تمہارے یہ تین سال

ہم ڈھونڈتے ہیں راستے اپنی نجات کے
ہیں موت سے بھی کول[1] تمہارے یہ تین سال

تعریف کا حسین سماں باندھتے ہو تم
پھر بھی اداس پھول تمہارے یہ تین سال

باہر سے ایک پائی بھی آئی نہیں یہاں
ڈھیلی پلنگ کی چول تمہارے یہ تین سال

لوگوں کا قتل عام ہے گیپا[2] کے نام پر
پچھتاوا ہو رہا ہے جتا کر تمہیں بہت
جمہوریت کی بھول تمہارے یہ تین سال

۱۔کول۔Cool

۲۔گیپا یعنی

گوشۂ سبطین پروانہ

سوانحی اشارے

اصل نام: سید غلام السبطین
تخلص: پروانہ
قلمی نام: سبطین پروانہ
تاریخِ ولادت: یکم اگست ۱۹۷۳ء
مقامِ پیدائش: دیلال پور۔کٹیہار (بہار)
ولدیت: جناب سید نیر اعظم (مرحوم)
تعلیم: مولوی (پٹنہ بہار ایجوکیشن بورڈ سے
ملازمت: ایک سرکاری اسکول میں اردو معلم
آغازِ شاعری: ۱۹۹۲ء
تلمذ: جناب راز ساغری ایم۔پی' جناب ثمر مانجوی' جناب صابادر بھنگوی
اشاعت: پہلی غزل کی اشاعت پندرہ روزہ بخشیات (کولکاتا) میں ۱۹۹۲ء کو شایع ہوئی۔

رسائل کے نام جن میں
تخلیقات شایع ہوئیں: سبقِ اردو' بتول' عبارت' خاتونِ مشرق' چراغِ اردو' زریں شعاعیں' پروازِ ادب' ماہنامہ آندھرا پردیش' گفتگو' صورت' ادبی محاذ' گلابی کرن' جامِ شہود' لیکھن
یاترا روپ کی شوبھا' جہانِ نعت' انقلاب' دوران' قومی تنظیم'
تصنیف: در دِنہاں (شعری مجموعہ) زیرِ طبع
گھر جنت: یاسمین عرف جاسمین آرا (شریکِ حیات)
اولاد: چار لڑکیاں اور ایک لڑکا
مشغلہ: درس وتدریس' مطالعہ اور شعر وشاعری
رابطہ: سبطین پروانہ۔دیلا پور۔پوسٹ سالماری کٹیہار۔855113 (بہار)
موبائل: 9472217246

ایک تعارف

سبطین پروانہ کی شخصیت عزم' حوصلہ اور جہدِ مسلسل جیسے عناصرِ ثلاثہ سے تشکیل پائی ہے۔پیدائشی طور پر دونوں ٹانگوں سے معذور ہونے کے باوجود وہ قنوطیت کا شکار نہیں ہوئے۔صبر وشکر کے ساتھ جدوجہد جاری رکھی اور خود کو اس قابل بنایا کہ اپنے خاندان کی کفالت کر سکیں۔اس طرح انھوں نے ایک عمدہ مثال قائم کی ہے جو دیگر معذوروں کے لئے مشعلِ راہ بن سکتی ہے۔اسی عالم میں انھوں نے پٹنہ ایجوکیشن بورڈ سے مولوی کا امتحان پاس کیا اور ایک سرکاری اسکول میں اردو معلم کی حیثیت سے ان کی تقرری ہوگئی۔

ان کے والد مرحوم گو سائنس کے ٹیچر تھے مگر گھر میں ادبی ماحول نہ تھا۔ایسے غیر ادبی ماحول میں سبطین پروانہ نے اپنی شاعری کو پروان چڑھایا جو ایک بڑی بات ہے۔شعری سفر ۱۹۹۲ء سے جاری ہے۔حمد ونعت اور نظم ان کی توجہ کا خاص محور ہیں۔اس قلیل عرصہ میں تقریباً ۴۰۰/کلام پر مشتمل شعری اثاثہ جمع کر لیا ہے لیکن مجموعے کی اشاعت اب تک نہیں ہو پائی ہے۔شاعری کے علاوہ نقد وادب سے بھی دلچسپی ہے۔شعری تخلیقات کے ساتھ ان کی نثری تخلیقات بھی مختلف اخبارات ورسائل کی زینت بن چکی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔اردو شعر وادب سے ان کی غایت دلچسپی اور ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ مستقبل میں وہ اپنا نام ضرور روشن کریں گے۔ہمیں اس حوصلہ مند شاعر کو آپ سے متعارف کراتے ہوئے دلی مسرت کا احساس ہو رہا ہے۔معزز قارئین سے گزارش ہے کہ گوشہ کے مطالعہ کے بعد انھیں اپنی گرانقدر آرا اور مفید مشوروں سے نوازیں۔

سید نفیس دسنوی

منیر سیفی
Suman pura ,BVS,
Patna-800014

سبطین پروانہ کا ''دردِ نہاں''

سید غلام السبطین کی پیدائش یکم اگست ۱۹۸۷ء اور شاعری کا آغاز ۱۹۹۲ء بتایا گیا ہے۔ میری سمجھ سے تاریخ پیدائش ۱۹۷۸ء کے بجائے ۱۹۸۷ء کمپوز ہوگئی ہے۔

شاعر کے لئے ایک عدد تخلص کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا سید غلام سبطین نے بھی پروانہؔ تخلص اختیار کیا اور اسی تخلص کے ساتھ ۱۹۹۲ء میں ۱۵ روزہ بخشیات کولکاتا میں سبطین پروانہ کی پہلی غزل شائع ہوئی تو دیگر رسائل میں بھی موصوف کی تخلیقات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سید نفیس دسنوی رقمطراز ہیں۔

''سبطین پروانہ کی شخصیت عزم، حوصلہ اور جہد مسلسل جیسے عناصر ثلاثہ سے تشکیل پائی ہے۔ پیدائشی طور پر یہ دونوں ٹانگوں سے معذور ہونے کے باوجود قنوطیت کا شکار نہیں ہوئے۔ صبر و شکر کے ساتھ جدو جہد جاری رکھی اور خود کو اس قابل بنایا کہ اپنے خاندان کی کفالت کرسکیں۔ اس طرح انھوں نے ایک عمدہ مثال قائم کی ہے جو دیگر معذوروں کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہے۔ اسی عالم میں انھوں نے پٹنہ ایجوکیشن بورڈ سے مولوی کا امتحان پاس کیا اور ایک سرکاری اسکول میں ایک اردو معلم کی حیثیت سے ان کی تقرری ہوگئی''۔

موصوف کے کلام کی تعداد (حمدیہ، نعتیہ، غزلیہ) تقریباً چار سو بتائی گئی ہے۔ امید قوی ہے کہ ان کے زیرِ طبع اولین شعری مجموعہ ''دردِ نہاں'' میں یہ رشحاتِ قلم جگہ پاسکیں گے۔ اس کے علاوہ موصوف میں نقد کی جراثیم ہونے کی اطلاع بھی دی گئی ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔ لہٰذا میری دلی خواہش ہے کہ موصوف جب درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے ہیں تو ایک ذرا ہمت سے کام لیں اور اس مصرعے کے مصداق: ؎ 'ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی' کے مصداق اپنی تعلیم جاری رکھیں۔ جس کا خاطر خواہ فائدہ ان شاء اللہ اپنی ملازمت میں ملے گا۔

فکر اساس شاعری آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے بہت ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے نیز شاعر کو مطالعہ کے ساتھ ساتھ تجربوں کے جذباتی و تخیلی مراحل سے جوجھنا ہوتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ شاعر کا اپنا ایک الگ مزاج بن جاتا ہے اور یہی مزاج اس کی شناخت قائم کرتا ہے۔ میرے خیال میں سبطین پروانہؔ ایسا کچھ کر دکھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ آیئے ہم سبطین پروانہؔ کے چند اشعار کے تعلق سے گفتگو کرتے ہیں:

پتھر کی چوٹ مجھ کو تو گھائل نہ کرسکی ۔ لیکن کلیجہ باتوں کے تیور سے کٹ گیا

سبطین پروانہؔ کے متعلق دسنوی نے جو کچھ رقم کیا ہے اس کی روشنی میں ایسا کہا جاسکتا ہے کہ ان پر طنز کے تیر بھی چلتے ہوں گے اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ ناوک فگن اغیار ہوں۔ احباب و اقارب بھی ہوسکتے ہیں۔ لیکن باتوں کے تیور سے کلیجہ کٹنے کی بات کسی اور ہی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ شخصیت شاعر سے قریب سے قریب تر اور قریب ترین بھی ہوسکتی ہے۔

پڑھ کے چہرہ سمجھ لیں حالت کو
حال مجھ سے بیاں نہیں ہوتا

شاعر غمِ دوراں بیان کرتے کرتے اتنا دل شکستہ ہو چکا ہے کہ اب اس میں دردو غم بیان کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ دیگر لفظوں میں کہہ سکتے ہیں یہ معاملہ ناگفتہ بہ ہے لہٰذا اب وہ مزاج پرسی کرنے والوں سے صاف صاف کہتا ہے کہ چہرہ پڑھ کر سمجھ لیں، میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ میرے خیال میں اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا ہے کہ دل پر جو گزرتی ہے وہ چہرے پر تحریر ہو جاتی ہے۔ اسے سمجھنے یا پڑھنے کے لئے پارکھی نظر چاہیے۔

جن کی تکلیف میں کام آتا رہا تھا میں بھی
وہ پڑوسی ہی مرے گھر کو جلانے نکلے

اپریل ۱۹۷۹ء کو رام نومی کے موقع پر جمشید پور میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا تھا۔ مشہور افسانہ نگار زکی انور نے فریقین سے آپسی ہم آہنگی کے لئے پرزور اپیل کی اور کہا کہ ماحول کو خراب ہونے سے بچایا جائے، ناحق کسی کا خون نہ بہائیں۔ اتنا ہی نہیں لوگوں کے منع کرنے کے باوجود بھی شانتی قائم کرنے کے لئے اپنے گھر سے باہر بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے، لیکن فسادیوں پر اس شانتی کے پجاری کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور قلم کاشت کرنے والے، علم کی دولت بانٹنے والے، امن و شانتی کے پیغامبر کو پڑوسیوں نے ہی تہہ تیغ کر ڈالا اور انہی کے گھر کے کنویں میں لاش پھینک دی۔ اب اس تناظر میں شعر کی قرأت کیجئے ؎

عبدالمتین جامیؔ
اردو بازار۔ پوسٹ پدمپور
ضلع۔کٹک۔ ۷۵۴۲۰۰

سید غلام السبطین پروانہؔ۔۔۔شاعرِ امروز

(بقیہ صفحہ 21 پر)

سید غلام السبطین پروانہؔ ادبی حلقوں میں اپنی شاعری کے حوالے سے جانے پہچانے فن کاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ عمر کے لحاظ سے نو جوان ہیں۔ ناچیز کی معلومات کے مطابق ابھی صرف ۳۰ ر بہاریں گزری ہیں۔لیکن بہت کم عرصے میں ہی شعروسخن کی اتنی دہلیزیں پار کرلی ہیں کہ سوچ کر تعجب ہوتا ہے۔ بسیار گوئی کا ایسا عالم ہے کہ انھوں نے اب تک کم وبیش چار سو غزلیں کہہ دی ہیں۔ یوں تو بسیار گوئی کوئی بری بات نہیں مگر دو چار شعر ہی اگر عمدہ ہو جائیں تو شاعر کو بقائے دوام مل سکتا ہے۔ کرامت علی کرامتؔ صاحب نے ایک دفعہ مجروح سلطان پوری جیسے شاعر کو لکھا تھا کہ ''آپ صرف ڈیڑھ شعر کے شاعر ہیں'' موصوف کا ایک شعر یہ ہے کہ:

ہم اکیلے ہی چلے تھے جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے رہے اور کارواں بنتا رہا

یہ شعر آج بھی زبان زدِ خاص وعام ہے اور مجروح کی شہرت دوام کا باعث بھی۔

ایسا بھی نہیں کہ مجروحؔ نے ترقی پسندی کے زعم میں صرف نظمیں ہی کہی ہوں بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کی غزلوں کا بھی ایک مجموعہ منظرِ عام پر آچکا ہے۔ بہر کیف ان کی شہرت غالباً انھیں ڈیڑھ اشعار کی مرہونِ منّت ہے۔ لیکن ان کے ایک شعر کا صرف ایک مصرع بھی مشہور ہو گیا ہے۔ وہ مصرع ہے:

؎ رقص کرنا ہے اگر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

اس لیے کرامت صاحب نے ان کو ڈیڑھ شعر کا شاعر کہا ہے۔

یہ شعر بھی کافی مشہور ہوا۔ اس شعر کے پہلے مصرع یعنی ''اک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل'' سے استفادہ کرتے ہوئے مجروح سلطان پوری نے دوسرا مصرع لکھ دیا کہ ''ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق''۔ شعروسخن کے دلدادہ حضرات تو ہیں ہی، عام لوگوں میں بھی یہ مصرع کافی مقبول ہوا۔ اس طرح سے مجروح ڈیڑھ اشعار کے شاعر ہو گئے۔ بہر کیف ان دونوں اصحاب کے فکری پہلو انہیں اشعار میں پنہاں ہیں۔ یوں تو شکیل بدایونی بھی فلموں کے لئے لکھتے رہے تھے اور مجروح بھی اسی راہ کے راہگیر تھے مگر اول الذکر شاعر رومانی شاعری کے دلدادہ تھے تو آخر الذکر شاعر یعنی مجروحؔ ترقی پسند شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ایسا بھی نہیں کہ مجروحؔ

نے ترقی پسندی کے زعم میں صرف نظمیں ہی کہی ہوں بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کی غزلوں کا بھی ایک مجموعہ منظرِ عام پر آچکا ہے۔ بہر کیف ان کی شہرت غالباً انھیں ڈیڑھ اشعار کی مرہونِ منّت ہے۔

اس تمہید سے ناچیز کی یہ مراد ہے کہ سیکڑوں اشعار کہنے سے بسیار گوکی شہرت تو مل ہی جاتی ہے لیکن ادب میں اس کے ذریعہ کوئی مقام نہیں بنایا جاسکتا۔ ہاں اس بات سے انکار نہیں کہ بسیار گوئی میں کچھ غزلیں ایسی بھی ہو جاتی ہیں کہ ایک آدھ شعر زبان زد خاص وعام ہونے کے لائق ہو جاتے ہیں۔

غلام سبطین پروانہؔ بذات خود ایک غیر ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناچیز کا جہاں تک خیال ہے کہ انھیں گھر کے باہر کا ماحول ضرور سازگار ملا ہوگا۔ لیکن میں خود اس سلسلے میں قطعی فیصلہ سنانے سے قاصر ہوں۔ ناچیز نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ''محض ماحول ہی کسی کو مکمل شاعر یا فن کار بنانانے کے لئے ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ اپنا یہ گمان ہے کہ اللہ رب العزت خالق و مالک ہے۔ خلق کرنا اس کی صفت ہے۔ وہ جو چاہے کرنے پر قادر ہے۔ اس نے بنی نوع آدم کو اپنی صفات عالیہ میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دے کر پیدا کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی شاعر بن جاتا ہے تو کوئی افسانہ نگار، کوئی مصوّر بن جاتا ہے تو کوئی گلوکار یا سنگ تراش۔

اللہ پاک نے سبطین جیسے معذور لوگوں سے بھی بڑے بڑے کام لئے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ تیمور لنگ جیسا انسان جس نے دنیا کے ایک بڑے حصے پر اپنا فوجی تسلط قائم کر لیا تھا، ایک پیر سے معذور تھا۔ بہر حال ناچیز کو یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ غلام السبطین پروانہؔ نے معذور کے باوجود تخلیقیت کا ایک جہان آباد کر دیا ہے۔ وہ اہل خانہ کی کفالت کے لئے ایک سرکاری مدرسہ میں درس وتدریس جیسے باعزت پیشے سے جڑے رہ کر اپنے شب وروز کو اردو شاعری کے گیسو

سنوارنے میں منہمک ہیں۔ناچیز کو اس بات کی بھی آگاہی ہوئی کہ وہ صرف غزل ہی نہیں بلکہ نظم ونعت نیز حمد باری تعالیٰ کہنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ان کی تخلیقات ہندوستان کے کئی اخبارات ورسائل کی زینت بن چکی ہیں۔

میرے سامنے اس وقت ان کے چند حمدیہ اور نعتیہ کلاموں کے علاوہ خالص غزلیں بھی موجود ہیں۔لیکن اتنے بسیار گو شاعر کی چند تخلیقات پر اکتفا کر کے کچھ منفی یا مثبت رائے قائم کرنا بہت مشکل امر ہے۔پھر بھی انھیں تخلیقات کو روبرو رکھ کر کچھ خامہ فرسائی کی جرأت کروں گا۔

موصوف کی غزلوں کی ساخت میں کہی ہوئی حمد باری تعالیٰ مجھے بہت متاثر کر گئیں۔موصوف نے اپنی جسمانی معذوری کے باوجود خالق کائنات کے خلاف کوئی شکوہ وگلہ نہیں کیا۔بہر حال خدا کی عظمت کا ذکر ہی ان کے حمدیہ کلام کا خاصہ ہے۔وہ خدا کی عظمت وشوکت کا ذکر جس شدتِ جذبات سے کرتے ہیں قاری دم بخود رہ جاتا ہے۔قرآن میں مذکور ہے سورج چاند اور ستارے اور دنیا میں موجود تمام چرند و پرند نیز نباتات اللہ کی تعریف میں ہمہ وقت ذکر و اذکار میں مصروف رہتے ہیں۔سبطین پروانہ نے اس بات کو اپنے ہر ایک شعر میں باندھنے کی کوشش کی ہے۔دو اشعار ملاحظہ فرمایئے:

میری سانس میں بھی خدا بولتا ہے
ہو کیوں کر نہ وردِ زباں حمدِ باری

لب پہ حمد باری ہے
وجد کی حالت طاری ہے

حضور پُر نور محمد ﷺ کی تعریف کرنے میں بھی موصوف رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ان کے حمدیہ کلام کی طرح نعتیہ کلام بھی دل پذیر ہے۔ان کی نعتوں میں بھی وہی سرشارانہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ایک شعر جس نے میرے دل کو سرشارانہ کیفیت سے ہم کنار کر دیا اس کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں:

نبی کی رضا ہی خدا کی رضا ہے
ہے قرآں میں یہ بھی لکھا دیکھ لینا

موصوف نے قرآن کی صحیح ترجمانی کی ہے۔خدا ان کی جھولی کو نیکیوں سے بھر دے گا۔نعتیہ کلام کہنے میں ان کی پختگی کا اندازہ اس شعر سے بھی ہو جاتا ہے:۔

روئے انور آپ کا دیتا ہے سب کو روشنی
جس کی ضو سے جل رہا ہے ماہ واختر کا چراغ

پروانہؔ شاہِ دیں کی عنایات بیکراں
کوتاہیوں کو میری کمالوں میں رکھ دیا

نعت وحمد کے علاوہ ان کی غزلوں میں بھی بلا کی چاشنی نظر آتی ہے۔ان کے چند اشعار غمِ ذات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔مثلاً:

میں ہوں کس حال میں اس کو کیا ہو خبر
اس کا احساس اس کو ذرا بھی نہیں

مجھ کو ملا نہ ساتھ کسی کا یہ غم نہیں
سایہ ہی میرے ساتھ ہمیشہ سفر میں ہے

آج کی اس تغیر پذیر دنیا میں عجیب وغریب واقعات رونما ہونے لگے ہیں۔ہم اپنے ایمان کے مطابق کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔آج انسان میں خیر وشر کی تمیز باقی نہیں۔لوگ اب سچ کی بجائے جھوٹ کو ترجیح دینے لگے ہیں۔اس تلخ حقیقت کو سبطین پروانہ نے بڑے سلیقے سے شعری زبان عطا کی ہے۔ملاحظہ فرمائیں:۔

آگئی ہے تیزی اب چال میں زمانے کی
آج کے زمانے میں کاہلوں کا کیا ہوگا

جو عیب میں تھی بات وہی اب ہنر میں ہے
لیکن تمیز کس کو یہاں خیر وشر میں ہے

آج کا جدید انسان جس کربِ ذات میں مبتلا ہے اس کی ترجمانی گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی سے ہونے لگی ہے۔اس کرب کے اظہار کے لیے شعرا نے اجتہادی رویہ اختیار کیا۔طرح طرح کے تجربات بھی کیے جس کے نتیجے میں لسانی شکست وریخت بھی ہوئی لیکن شکر ہے کہ جلد ہی وہ راہِ راست پر آگیے اور اعتدال کی راہ اختیار کی۔انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ صرف مایوسی کا اظہار اور کربِ ذات کی ترجمانی ہی جدیدیت کی پہچان نہیں ہے بلکہ اس پر آشوب دور میں جینے کے لیے عزم وحوصلہ کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔اب بھی انسانیت کو مکمل موت نہیں ہوئی ہے۔آج بھی انسان کا ضمیر زندہ ہے۔آج بھی ہمدردی اور مروت جیسے ارفع جذبات کچھ لوگوں میں باقی ہیں۔آج بھی ایسے انسان ہیں جو کسی نابینا شخص کو راستہ پار کرانے میں معاون ہوتے ہیں۔آج بھی لوگ امن وسکون کو جنگ وجدال پر ترجیح دیتے ہیں۔اس ضمن میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کام سب کے آسکوں
دل کو وہ ارمان دے

کام میرا ہے دلوں کو جوڑنا اے دوستو
دشمنوں کے درمیاں بھی رابطہ کر جاؤں گا

اپنے ہمسائے کو تکلیف نہ ہونے پائے
اپنے اس فرض کو ہر حال نبھائے رکھنا

قدرتی آفات کے منفی پہلوؤں پر سب کی نظر رہتی ہے مگر پروانہؔ اس میں مثبت پہلو بھی ڈھونڈ لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ قدرتی آفات دراصل غافل لوگوں کو جگانے کے لیے رونما ہوتی ہیں۔۔مثلاً

بڑے آرام سے جو سو رہے تھے
انھیں طوفاں جگا کر جا رہا ہے

بعض جگہ اسلامی تلمیحات کا برملا استعمال کر کے انھوں نے اپنے اشعار کو گہرائی و گیرائی عطا کی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

ریگِ صحرا پر پڑی جب ایڑیوں کی ضرب تو
نیم مردہ کو ملا آبِ بقا دیکھو میاں

وہ صحرا کو اپنا مکاں کرنے والے
وہی ریت کو گلستاں کرنے والے
دکھائیں گے پُر کیف منظر سبھوں کو
طلسماتی ہر سو فضا کرنے والے

اب کیسے کریں سامنا ہم دشمنِ دیں کا
اب خالد و ضرار کی تلوار کہاں ہے

چونکہ پروانہ دینی تعلیم سے آراستہ ہیں اور انھیں اسلامی تاریخ کا علم بھی ہے اس طرح کے تلمیحی اشعار ان کے یہاں شعوری اور لاشعوری طور پر اکثر و بیشتر وارد ہوتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری اور بھی دل پذیر ہونے لگی ہے۔ ان کی شاعری کا یہ پہلو بھی نمایاں ہے جس میں انھوں نے عصری مسائل اور معاشرتی ناہمواریوں کو جزوِ شاعری بنایا ہے۔ سیاسی ہتھکنڈے ہوں یا اخلاقی پستی 'مذہبی منافرت' دہشت گردی' دنگے فسادات آج کل روزمرہ کی زندگی ہو کر رہ گیے ہیں۔ ان سبھی موضوعات کا احاطہ پروانہ نے بھی اپنے طور پر کیا ہے اور لوگوں تک مثبت پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ چند شعر دیکھیں:۔

بے خطا لوگوں کو اب کٹتا ہوا دیکھو میاں
نام پر مذہب کے ہے یہ سانحہ دیکھو میاں

کرم یہ بھی اپنے رہنما کا۔ مری بستی جلائی جا رہی ہے

رشوت خوری چاروں جانب۔ اپنا ہندوستان بچاؤ

جھوٹے وعدے کر کے نیتا۔ جنتا کو اب لوٹ رہے ہیں

آ گئی ہیں سبھوں میں وہ مکاریاں
آج لوگوں میں پہلی شرافت کہاں

آج کل مشاعروں کا معیار کافی گر چکا ہے۔ گلے باز شعرا کا دور دورہ ہے۔ خواہ مسروقہ کلام کیوں نہ ہو سستی شہرت حاصل کرنے کی مذموم کوشش جاری ہے۔ منور رانا نے اپنی شاعری میں ''ماں'' پر اشعار کہہ کر جب مقبولیت حاصل کی تو مشاعرہ باز شعرا بھی دھڑا دھڑ ماں پر شعر کہنے لگے۔ یہاں میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ لفظ ''ماں'' کسی وبائی مرض کی طرح اردو شاعری میں پھیل چکا ہے۔ سبطین پروانہ کی شاعری میں بھی ''ماں'' کا استعمال کثرت سے ہوا ہے مگر سلیقے سے انھوں نے اپنی بات کہی ہے۔ یہاں مختلف موضوعات پر ان کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:۔

ملتِ اسلامیہ کی کج روی:

ہے چال اس کی اب تو مسلسل ڈھلان پر۔ پرواز جس نے کی تھی کبھی آسمان پت

اپنی غیور فطرت:

مشکلوں میں بھی نہ پھیلایا کبھی دستِ طلب
آج تک باقی ہے یہ شانِ انا دیکھو میاں

بلند حوصلگی:

جتنا بھی آزمائیں مرے ظرف کو مگر
میں کامیاب اتروں گا ہر امتحان پر

حب الوطنی:

جس میں سب خوش حال رہیں
ایسا ہندوستان دے

مختصراً کہنا چاہوں گا کہ ان کی شاعری کا کینوس بے حد وسیع ہے جس کا احاطہ سرِ دست میرے لیے ممکن نہیں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ انھوں نے جن باتوں کا مشاہدہ کیا اور زندگی کے جو تجربات حاصل کیے ان سبھوں کو شعری قالب میں پیش کر دیا ہے۔ اس میں ذاتی کرب بھی ہے اور کربِ کائنات بھی۔ بہر حال یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ پیدائشی معذوری کے باوصف ان کے عزائم بلند ہیں اور زندگی میں کچھ کر گزرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ارادوں کو استقامت عطا فرمایے اور وہ ایک مثالی انسان بن جائیں۔

خوشی کی بات ہے کہ ان کی شاعری میں خامیاں بہت کم ہیں۔ امید ہے کہ مشق و مزاولت سے یہ بھی دور ہو جائیں گی۔ اگر وہ سنجیدگی سے کوشش جاری رکھیں تو اردو ادب میں ان کا مستقبل تابناک ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ اپنی خلیق فطرت اور منکسر المزاجی کے سبب وہ نہ صرف اپنے معاشرے میں عزت کا مقام حاصل کریں گے بلکہ یاد بھی رکھے جائیں۔ انھیں کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:۔

سبطین پروانہ کا اولین مجموعۂ کلام
درد نہاں
جلد ہی منظرِ عام پر آنے والا ہے
اس میں شامل ان کی حمدیں' نعتیں اور غزلیں آپ کو ایک نیے ذائقے سے روشناس کرائیں گی

سنہ ۶

شارق عدیل
At/P.O: Marhera
Dist: Etah-207401(U.P)

غزل کی شمع سے کرتا ہے عشق پروانہ

رہے گا یاد پروانہؔ ہمیشہ
وہ دل میں گھر بنا کر جارہا ہے

☆☆☆

سبطین پروانہؔ ایک ایسے شاعر و ادیب ہیں جن کا حوصلہ مثالی ہے، اور زندگی سے مایوس ہو جانے والے لوگوں کے لئے ایک سبق بھی، کیونکہ وہ دونوں ٹانگوں سے پیدائشی طور سے معذور ہیں۔ اور یہ بات بھی بالکل درست ہے کہ جن والدین کے یہاں معذور بچے پیدا ہو جاتے ہیں انھیں ان کے مستقبل کی فکر شب و روز ڈستی رہتی ہے، لیکن قدرت کا کمال دیکھئے کہ ان معذور بچوں میں بھی کچھ بچے ذہنی طور پر اس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ زمانے کے لئے مثال بن جاتے ہیں اور اپنے والدین کے تمام اندیشوں کو اپنی محنت اور لگن سے غلط ثابت کر دیتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں سبطین پروانہ کی شخصیت کو فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے دونوں ٹانگوں کے کی معذوری اور زندگی کے جبر کو بہت ہی صبر کے ساتھ برداشت کیا ہے اور تعلیم کے راستے کو اپنی منزل بنانے کے جنون میں ہر مشکل کو اپنے آہنی ارادوں سے آسان بنا دیا جس کے نتیجے میں وہ ایک سرکاری درس گاہ میں مدرس ہو گئے ہیں، اور اپنے خاندان میں مع اہل و اعیال مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنے طلبہ کو ایک اچھا انسان بنانے کا پاٹھ پڑھانے کے ساتھ انھیں زندگی کے جبر سے لڑنے کا حوصلہ بھی عطا کر رہے ہیں، کیونکہ انھیں زندگی نے کھیلنے کی عمر میں سنجیدگی کے حوالے کر دیا تھا، اور وہ اپنی تمام تر سوچوں کو نظم و نثر کی صورت میں قرطاس پر پرونے میں مصروف ہو گئے۔

اردو شاعری میں غزل ایک ایسی شعری صنف ہے جسے اپنے حسن پر کل بھی ناز تھا اور آج بھی ہے، کیونکہ اردو زبان کے بیشتر شاعر غزل کے راستے سے ہی شعری دنیا میں داخل ہوتے ہیں، لیکن ان دنوں نئے لوگوں کی شاعری کو پوری طرح نظر انداز کیا جا رہا ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اس وقت جو غزل کی تخلیقی بہتات ہے اس کی نہ تو کوئی اہمیت ہے اور نہ ہی کوئی معنویت ہے، لیکن میرا خیال ہے اگر اس منظر پر ایمانداری سے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے نظر ڈالی جائے تو نتیجہ اتنا مایوس کن بھی برآمد نہیں ہوگا جتنا ظاہر کیا جا رہا ہے، کیونکہ غزل کے جدید تر شعراء بھی زندگی کو اپنے خیالات کے آئینے میں رکھ کر دیکھ رہے ہیں اور غزل کی راہوں کو اپنے تجربات و جذبات کے چراغوں سے مزین کرنا چاہتے ہیں۔ جس کے ثبوت میں غزل کے حساس شاعر سبطین پروانہ کے کلام کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کے
یہاں زندگی سے سے متعلق مثبت احساسات پائے جاتے ہیں۔

جتنا بھی آزمائیں مرے ظرف کو مگر۔ میں کامیاب اتروں گا ہر امتحان پر

کام میرا ہے دلوں کو جوڑنا اے دوستو
دشمنوں کے درمیاں بھی رابطہ کر جاؤں گا

تحریر کردہ اشعار کے مفاہیم انسانی زندگی کی سچائیوں سے بہت ہی گہرا ربط رکھتے ہیں۔ کیونکہ شاعر کا حوصلہ جسمانی معذوری سے بغاوت کی صورت میں ابھرتا ہے اور کبھی کمزور نہیں پڑتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ وہ لوگوں کے اندر بکھراؤ کی خو کو بھی پسند نہیں کرتا ہے اور وہ تمام دنیا کے انسانوں کو ایک خاندان کی صورت میں دیکھنا پسند کرتا ہے اور اس دنیا کے تمام لوگوں کو رابطے کی برکتوں سے پوری طرح باخبر کرنا چاہتا ہے اور اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ حساس دل شاعر کے یہاں محبت کا دریا ہمیشہ اوپھان پر رہتا ہے۔ صرف ایک مثال دیکھیں:

جس کا سایہ مرے ہمسائے کے گھر تک پہنچے۔ اک گھنا پیڑ بھی آنگن میں لگایا جائے

سبطین پروانہ کی غزلیہ شاعری روایت سے رشتہ جوڑ کر چلتی ہے اور اپنے عصر کے حالات و حادثات کو بھی شعری زبان میں بیان کرنے کی پوری کوشش کرتی ہے اور کبھی کبھی اپنے مختلف ہونے کا ثبوت بھی فراہم کر دیتی ہے۔

آ گئی ہے تیزی اب چال میں زمانے کی۔ آج کے زمانے میں کاہلوں کا کیا ہوگا
فضا پر عجب دہشت ہے طاری۔ یہاں کیسی حکومت ہو گئی ہے

شاعر کاہلی کو انسان کے لئے ایک خطرناک شئے تصور کرتا ہے۔ اس لئے شہر کی تیز رفتار زندگی کو دیکھ کر سوچنے لگتا ہے کہ اس دور میں کاہلوں کا کیا ہوگا؟ یہ کیسے زندگی کے ساتھ چل پائیں گے۔ اس لئے وہ اپنے احساسات و محسوسات کو اشارات و کنایات کے وسیلے کاہلوں کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ تا کہ وہ اپنی فطرت کا محاسبہ کر سکیں۔ شاعر موجودہ سیاست کے رویّے سے بھی نالاں ہے۔

سنہ ۶

کیونکہ اس وقت بھگوا سیاست کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی جا رہی ہے اس میں بربادی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ اور اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ طاقت اور سیاست کے نشے میں چور ظالم افراد نے کبھی اپنے ماضی سے سبق حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اور اگر وہ ایسا کرتے تو ظلم سے توبہ کر چکے ہوتے۔

بے خطا لوگوں کو اب کٹتا ہوا دیکھو میاں
نام پر مذہب کے ہے یہ سانحہ دیکھو میاں
اللہ جانے کتنے مرے ہیں فساد میں۔ اک بھیڑ سی لگی ہے کفن کی دکان پر
پتھر کے بازار میں دیکھو۔ کتنے شیشے ٹوٹ رہے ہیں
سسکتے ہیں یہاں مظلوم سارے۔ ستم گر گل کھلا کر جا رہا ہے

سبطین پروانہ کے کسی بھی شعری مناظر میں مایوسی کی جھلک نظر نہیں آتی ہے۔ کیونکہ ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ حوصلوں کے نور سے منور رہے۔ سبطین پروانہ کے یہاں حمد و نعت کی تخلیق کا صادق جذبہ بھی پایا جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنے خالق اور اس کے محبوب کی اطاعت سے کبھی غافل نہیں رہتے ہیں۔ اور جو انسان اپنے خالق اور اس کے محبوب پر مکمل ایمان رکھتا ہے وہ دنیا کی بلاؤں کے سامنے کبھی کمزوری کا اظہار نہیں کرتا۔ دو حمدیہ اشعار دیکھیں:

لب پر حمد باری ہے۔ وجد کی حالت طاری ہے
تیرے کرم کے سایے میں۔ زیست ہماری جاری ہے

مذکورہ حمد میں شاعر کے جذبے کے ساتھ زبان کے لطف کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے اور یہیں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی ایمانی کیفیات کو اس کے نعتیہ اشعار میں بھی محسوس کیا جائے

ہاتھ میں آ گیا دامنِ مصطفیٰؐ۔ مجھ کو فردوس کا راستہ مل گیا
نام سے جس کے طوفان رُخ موڑ دے۔ میری کشتی کو وہ ناخدا مل گیا

سبطین پروانہ اسلامیات کی پُر نور تعلیمات پر مکمل ایمان رکھتے ہیں اور تخلیقی لمحوں میں اس کا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن وہ ایسے لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتے جو بغیر اصرار کے ہی معذوروں پر رحم کھانے کا ڈھونگ کرتے ہیں یا ان کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

میں مضمون کے آخر میں ان کا ایک ایسا شعر درج کر رہا ہوں جو ان کی معذوری کی طرف تو اشارہ کرتا ہے، ان کی بے بسی کی طرف نہیں۔ اور سبطین پروانہ کی یہ شعری خصوصیت ہی ایک دن ان کی شاعری کی ہر راہ کو ہموار کر دے گی۔

ہوں معذور یہ سب کو بتا دو۔ مذاقاً دیکھنا اچھا نہیں ہے

☆☆☆

(سبطین پروانہ کی تقدیسی شاعری کا بقیہ)

رسول اللہ کا روضہ زمیں پر باغِ جنت ہے
یہ دل قربان ہے قربان ہے تسلیم کرتے ہیں
فصیلِ قلبِ مضطر پر مرے ہر سمت آویزاں
انھیں کے نام کی بس تختیاں ہیں بات ہی کیا ہے

انھوں نے اپنی نعتیہ شاعری کو عصری حالات سے ہم آہنگ کرنے کی بھی بڑی عمدہ کوشش کی ہے۔ آج امتِ مسلمہ جس بحرانی دور سے گزر رہی ہے اس کا علم ہر کسی کو ہے۔ اسلام کے خلاف یہود و نصاریٰ کی ریشہ دوانیاں جاری ہیں۔ فتنہ و فساد برپا کر کے مسلمانوں کو تنگ کیا جا رہا ہے۔ آپس میں مسلکی تضادات اور مسلم ممالک جیسے مصر و شام میں برادر کشی کا سلسلہ بھی جاری ہے جس کے پسِ پشت یہی اسلام دشمن قوتیں کارفرما ہیں۔ ایسے سنگین حالات میں ہر مسلمان اللہ اور اس کے رسول کے دامن میں ہی میں پناہ لیتا ہے اور مدد کا طالب ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سبطین پروانہ بارگاہِ رسالت مآب میں اس طرح دست بدعا ہوتے ہیں:

بڑا ظلم ہے آپ کے امتی پر
اے رحمت لقب اک نظر دیکھ لینا
اک نگاہِ کرم ہو ادھر بھی شہا
غم کا آیا ہے طوفان پیارے نبی

ان کی نعتیہ شاعری میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور سیرتِ پاک کے اور بھی بہت سے روشن گوشے اجاگر ہوئے ہیں جن کا احاطہ اس مختصر سے مضمون

بیادِ ڈاکٹر جلیل اشرف
سہ ماہی **افقِ ادب** ہزاری باغ
اردو زبان و ادب کا ترجمان
مدیر اعلیٰ۔ علی منیر　زرِ سالانہ۔ ۱۰۰ روپے
رابطہ: علی منیر (سابق پرنسپل) فرینڈس کالونی۔ پگمل
ہزاری باغ۔ ۸۲۵۳۰۱ (جھارکھنڈ)

اشاعت کا ۲۹ رواں سال
ماہنامہ **لاریب** لکھنؤ
ایڈیٹر۔ رشید قریشی　زرِ سالانہ۔ دو سو روپے (مع ڈاک خرچ)
رابطہ: ۔ ایڈیٹر لاریب۔ 30 محمد علی لین۔ امین آباد
لکھنؤ۔ 226018 (یوپی)

ایم۔نصراللہ نصر (کولکاتا)
Mob:9339976034

پروانہؔ ہم بھی ہیں سخن کے آسمان پر

میں ممکن نہیں۔قارئین ہی بنفسِ نفیس اس کا مطالعہ کرکے استفادہ کرسکتے ہیں۔

آخر میں اتنا کہنا چاہوں گا کہ سبطین پروانہ کی نعتیہ شاعری تیزی سے ارتقائی منزلیں طے کرتی جارہی ہے۔اگر وہ صدقِ دل سے مشق ومزاولت جاری رکھیں تو جلد ہی اقلیمِ نعت میں اپنا مقام بنالیں گے۔میری نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں۔اس اولین مجموعے کی اشاعت پر انھیں دلی مبارکباد دینے کے علاوہ دعا کرتا ہوں کہ یہ نعتیہ شاعری ان کے لئے توشۂ آخرت ثابت ہو۔

☆☆☆

شاعری صرف لفظوں کی بنت کاری نہیں بلکہ فکر ونظر کا اظہار، احساس وجذبات کی عکس ریزی اور روح کی لہو پاشی کا ثمرہ ہوا کرتی ہے جو سہل پسندی اور عجلت بازی سے گریز کرتی ہے۔مشاقیت' محنت ومجاولت کا تقاضا کرتی ہے۔یہ خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے والی بات نہیں۔عرق ریزی اور دیدہ ریزی بھی اس کی شرطوں میں شامل ہیں۔لیکن کیا کیجیے دل ہے کہ مانتا ہی نہیں۔ہر ذی نفس شعر وسخن کا دلدادہ ہے اور اس سے انسیت رکھنے کا جذبہ رکھتا ہے۔اس لئے کہ یہ روح کی آواز اور دل کے دھڑکنوں کی صدا ہوتی ہے۔لہٰذا جذبات کی یہی لہریں لفظوں کا لبادہ اوڑھے صفحہ قرطاس کی زینت بن جاتی ہیں اور شعر کہلاتی ہیں۔

سبطین پروانہؔ دونوں پاؤں سے معذور ضرور ہیں مگر ذہنی طور پر صحت مند ہیں۔شاعری کے جراثیم ان کے ذہن وفکر میں جوان ہیں۔وہ سخن ساز بھی ہیں اور سخن طراز بھی۔شعر کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔کوشش بھی اچھی کرتے ہیں علم وہنر کا سارا زور بھی صرف کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خامۂ سخن سے کچھ گہر پارے بکھر کر قلبِ اوراق کی زینت بن جاتے ہیں جو بعد ازاں پکی روشنائی کی شکل میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ بہت بڑے اور مشاق شاعر ہیں اور فنِ سخن گستری سے کماحقہ واقف ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ ابھی رہگزارِ جہد وعمل میں ہیں۔کوشش کی بارگاہ میں سجدہ ریزی جاری ہے۔دربارِ سخن میں باریابی کے لئے دعا گو ہیں ان کی یہ دعا کس حد تک قبول ہوئی ہے ملاحظہ فرمائیں:

اللہ جانے کتنے مرے ہیں فساد میں۔اک بھیڑ سی لگی ہے کفن کی دکان پر
جتنا بھی آزمائیں مرے ظرف کو مگر۔میں کامیاب اتروں گا ہر امتحان میں

مذکورہ دو شعر کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف میں شعر گوئی کی صلاحیت موجود ہے۔افکار وخیال کی بلندی اور مضامین کا انتخاب کتنا عمدہ ہے۔نیز اسلوبِ نگارش کی داد نہ دینا حق بیانی میں کنجوسی کرنے کے مترادف ہوگا۔فساد پر ہزاروں اشعار نظر سے گزرے ہوں گے مگر یہ انداز اور اسلوب شاید ہی کسی کے شعر میں ملے ہوں گے۔

فساد کے روح فرسا نتائج کی عکس نگاری کا جواب نہیں۔اس شعر میں کفن کی دکان کلیدی ترکیب ہے جس میں ایک سچائی پوشیدہ ہے۔جس میں اشارے وکنایے میں ایک بہت بڑی بات کہی گئی ہے۔لہجے کی یہی انفرادیت شعر اور شاعر دونوں کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔مرتبہ بلند کرتی ہے اور محفلوں اور مجلسوں میں پذیرائی کا سبب بھی بنتی ہے۔

موصوف کا اصل نام سید غلام السبطین' تخلص پروانہ' تاریخ ولادت یکم اگست ۱۹۷۳ء مقام دیلال پور۔کٹیہار (بہار) اور ولدیت سید نیر اعظم (مرحوم) ہے۔تعلیم مولوی تک اور پیشہ معلمی ہے۔شاعری کا آغاز ۱۹۹۲ میں کیا اور راز ساغری' ثمر مانچوی اور صبا در بھنگوی سے اصلاح لی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروانہ صاحب کو شاعری کا شوق جنون کی حد تک ہے۔درجنوں اخبارات اور رسائل میں تواتر کے ساتھ چھپتے رہے ہیں اس سے ان کی ذہنی پختگی کا ثبوت ملتا ہے۔ہر چند کہ ابھی تک کوئی شعری یا نثری مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا ہے لیکن چند ایک اشاعت کی قطار میں ضرور کھڑی ہیں۔

جہاں تک ان کی شاعری کے معیار ومرتبے کا تعلق ہے تو شاعری کی مدت کے اعتبار سے انھوں نے بساط بھر اچھے اشعار کہنے کی کوشش ضرور کی ہے۔معاملہ 'پسند اپنی اپنی' کا ہے مگر کچھ اشعار کی تعریف تو دشمنِ سخن بھی کرسکتا ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

وہ مجھ پر رحم کھا کر جارہا ہے۔مرے دل کو دکھا کر جارہا ہے
خریدے گا ضمیر آکر وہ میرا۔ابھی قیمت لگا کر جارہا ہے
مشکلوں میں بھی نہ پھیلایا کبھی دستِ طلب

سنہ ۶

آج تک باقی ہے یہ شانِ انا دیکھو میاں

مذکورہ اشعار میں گرچہ عام گفتگو کی گئی ہے لیکن بڑے سلیقے اور نئے اسلوب کے ساتھ۔خوداری اور طبیعت کی پختگی بھی قابلِ توجہ ہے۔کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ شاعری میں اب کہنے کو رہ کیا گیا ہے جو کچھ بھی کہنا تھا وہ ہزاروں بار کہا گیا ہے۔دہرانے کا عمل اب بھی جاری ہے۔وہی عشق و محبت' ہجر وصال' ستم وکرم' زلف وکاکل' لب ورخسار' دکھ سکھ' پند ونصائح اور شکوے گلے کی باتیں آج بھی شاعری کے عام موضوعات رہے ہیں۔لیکن ایسا نہیں ہے کہ شاعری میں دلچسپی کے سامان اب عنقا ہو گئے ہیں۔اللہ نے جو کچھ دنیا اور دونوں جہان کو بخشنا تھا بخش دیا ہے لیکن انسان کب مطمئن ہونے والا ہے۔نئ تکنیک اور اضافے کا عمل آج بھی جاری ہے۔ترمیم وتشکیل کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس سے دنیا کی رونق روز افزوں بڑھتی جارہی ہے۔شعرا بھی انھیں الفاظ' محاورات' تراکیب' استعارے' افکار وخیالات اور تکنیک کے سہارے کچھ نئ بات کہنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں جو قدیم شعرا کے کشکول میں بھی رہے۔جس سے استفادہ کر کے آج کے شعرا کامیاب ہو رہے ہیں لیکن کبھی کبھی روایت کے پاسدار ہو کر بھی رہ جاتے ہیں۔پروانہ صاحب کے یہاں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن کے مطالعے سے کبھی جدت و ندرت کا گمان ہوتا ہے اور کبھی روایت کی پاسداری کا احساس۔اشعار ملاحظہ فرمائیں:

غم بھی دیتا ہے ذائقہ مجھ کو۔سب کو لیکن پتہ نہیں ہوتا

پتھر کی چوٹ مجھ کو تو گھائل نہ کر سکی۔لیکن کلیجہ باتوں کے تیور سے کٹ گیا

پروانہؔ دوستوں کو کوئی ٹھیس نہ لگے۔رکھتا ہوں میں بھی حلقۂ احباب کا خیال

حالات حاضرہ کی عکس ریزی شعرا کی بصیرت و بصارت نیز تازگی کا احساس ضرور دلاتی ہے۔جس شاعر کی نظر اپنے گرد و پیش نیز ملکی و عالمی حالات پر ہوتی ہے اور ان کی عکس ریزی اور منظر کشی میں وہ کامیاب ہوتا ہے اس کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے کیوں کہ تازگی اور توانائی' دلکشی اور ندرت' فنی مہارت اور ہنر مندی ہی شعر اور شاعر کے وقار وشہرت کی ضمانت ہیں۔شراب پرانی سہی لیکن نئ پیکنگ اس کے ذائقے اور خمار میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔پروانہ صاحب نے بھی کچھ ایسی کوششیں کی ہیں ملاحظہ کریں:

وہ صحرا کو اپنا مکاں کرنے والے۔وہی ریت کو گلستاں کرنے والے

دکھائیں گے پُر لطف منظر سبھوں کو۔طلسماتی ہر سو فضا کرنے والے

جس کا سایہ مرے ہمسائے کے گھر تک پہنچے۔اک گھنا پیڑ بھی آنگن میں لگا یا جائے

پروانہ صاحب ملک کے سیاسی حالات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور جو واقعات و حادثات رونما ہوتے ہیں اس کی تصویر کشی سلیقے سے کرتے ہیں۔قومی جذبے کا اظہار بھی ندرت بیانی کے ساتھ کرتے ہیں۔اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

فضاؤں میں عجب دہشت ہے طاری۔یہاں کیسی حکومت ہو گئی ہے

حکومت ہے ظالم کی پروانہ اب تو۔کہ آلودہ خوں سے فضا ہو نہ جائے

خطا کرتا ہے کوئی اور ہم پر۔سدا تہمت لگائی جارہی ہے

جس میں سب خوشحال رہیں۔ایسا ہندوستان دے

درج بالا اشعار کے مطالعے سے شاعر کے جذبات وخیالات کی مصوری صاف نظر آرہی ہے۔شاعر سب کچھ دیکھتے ہوئے قومی جذبے سے سرشار ہو کر اپنے وطن کو جنت سے تشبیہ دیتا ہے۔شاید کبھی ہمارا ملک ایسا رہا ہو۔لیکن حقیقت سے انکار بھی نہیں ہے۔ملک میں جو دہشت' خوف اور عدم رواداری کا ماحول بنا ہوا ہے اس کی طرف بھی سچائی کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔ایک خاص طبقے کی پائمالی و پریشانی کا ذکر بھی خوب ہے بلکہ ملک میں خوں آلود فضا استوار ہونے کے سبب لوگ جس قدر غیر مطمئن ہیں اس کی بھی تصویر سازی خوب کی ہے۔پھر اپنے خواب کا اظہار بھی کیا ہے کہ ہمارا وطن ایسا ہو جس میں ملک میں سبھی بسنے والے خوشحال رہیں۔بلا امتیاز مذہب وملت' رنگ ونسل اور ذات پات سب کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔آپسی بھائی چارہ قائم رہے۔بلا خوف وخطر لوگ اپنی مذہبی اور فکری آزادی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔شاعر کا خیال نیک ہے اور جذبات بھی قابلِ داد ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ شاعری کے کچھ خاص تقاضے ہوا کرتے ہیں جس کی پاسداری میں شاعر سے اکثر چوک ہو جاتی ہے۔اس لئے اسے ہر لمحہ محتاط رہنا چاہئے۔فنی خامیاں ہی زیر نظر نہ ہوں معنوی اعتبار سے بھی اس پر نظر ہو۔شعر کے محاسن کا بھی خیال ہو۔تعقیدِ لفظی کا بھی احساس ہو۔تکرار لفظی سے کبھی کبھی شعر کا حسن نکھر جاتا ہے مگر کبھی کھردرے پن کا بھی احساس ہوتا ہے۔موضوعی پیش کش میں مطابقت و مفاہمت کی طرف بھی توجہ ہو۔میں یہ نہیں جتانا چاہتا کہ پروانہ صاحب کی نظر ان نکتوں کی طرف نہیں ہے بلکہ بے خیالی میں کبھی کبھی ایسی کچھ باتیں رہ جاتی ہیں جو نظر ثانی سے دور ہو جاتی ہیں۔چند اشعار ملاحظہ کریں:

شکر ہے وہ حبیبِ خدا مل گیا۔سارے عالم کا وہ رہنما مل گیا

(وہ کا دوبار استعمال سے شعر کے حسن میں خراش آ گئی ہے)

لوگ کرتے ہیں تعریفیں ان کی۔کام جب بے مثال ہوتے ہیں

اس کی بحر دراصل فاعلاتن مفاعلن فعلن ہے' کام جب بے مثال ہوتے ہیں' لیکن مصرع اولٰی کی بحر بدل گئی ہے فاعلاتن مفاعیلن فعلن ہو گئی ہے' لوگ کرتے ہیں تعریفیں ان کی' اگر یہ مصرع یوں کر دیا جائے'' لوگ کرتے ہیں ان کی تعریفیں'' تو شعر درست ہو جائے گا۔جب کا محل بھی اپنی بے سبب موجودگی کی

سنہ ۶

طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں جو کا استعمال مناسب ہوتا۔

سب کی بگڑی جو وہ بنا تا ہے
رات دن اس کا دھیان ہے بابا

اس شعر کا مفہوم واضح ہو کر بھی واضح نہیں ہوا ہے۔اس میں فاعل کون ہے اور مفعول کون ہےاس کا خلاصہ ہونا چاہئے تھا اگر یہ شعر اس طرح کہا گیا ہوتا تو شاید قاری ذہنی ورزش سے بچ جاتا۔

سب کی بگڑی تو ہی بنا تا ہے۔ تجھ کو سب کا دھیان ہے بابا

میں کوئی استاد نہیں اور نہ اصلاح کار۔ میری سمجھ میں کچھ ایسا ہی آیا ہے جس کا برملا اظہار میں نے کر دیا ہے۔امید ہےاس میں برا ماننے کا کوئی سوال نہیں۔

ان معمولی تسامحات کے باوجود پروانہ صاحب کے یہاں شاعری کے سارے لوازمات موجود ہیں ۔فن شعر گوئی سے بھی وہ واقف ہیں ۔مضامین بندی کا ہنر انھیں خوب آتا ہے ۔لفظوں کی زیبائش اور آرائش کا سلیقہ بھی وہ جانتے ہیں ۔ جدت وندرت پیدا کرنے کی لیاقت وجسارت بھی رکھتے ہیں۔ میری رب سے دعا ہے کہ ان کی شاعری میں اورنکھار آئے اور شہرت ومقبولیت ان کے قدم چومیں ۔آمین ۔انھیں کے اس شعر پر اجازت چاہوں گا:

التجا کرتا ہے پروانہ اسے کر دے عطا
یا خدا شعر وسخن میں نام وشہرت بے مثال

☆☆☆

(سبطین پروانہ کا درد نہاں کا بقیہ)

جن کی تکلیف میں کام آتا رہا تھا میں بھی۔ وہ پڑوسی ہی مرے گھر کو جلانے نکلے

میری سمجھ سے ’جن کی تکلیف‘ کے بجائے ’جن کے دکھ درد‘ نیز بھی کی جگہ ’سدا‘ کہنے سے شعر میں مزید زور پیدا ہو سکتا تھا۔

سبطین پروانہؔ نے آزاد ملک میں آنکھیں کھولیں ۔انھوں نے غلامی کا عہد نہیں دیکھا۔ نہ ہی ملک کی تقسیم اور ہجرتِ عظیم کی صعوبتوں کا ذائقہ چکھا۔لیکن یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اپنے ہی آزاد ملک میں بے گھری کے کرب سے دو چار ہیں اور خود کو کبھی دھرتی سے کٹا ہوا دیکھتے ہیں تو کبھی امبر سے۔اور یہ المیہ سبطین پروانہؔ کا کوئی ذاتی المیہ نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ کچھ لوگ چہرہ صاف کرتے ہیں تو کچھ لوگ صرف آئینہ۔لیکن شاعر نے آئینہ کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی صاف کیا اور دیکھا کہ ان کی طرح ایک بہت بڑی آبادی اس بے گھری کے کرب سے جو جھ رہی ہے ۔ذیل کا شعر ہماری نام نہاد آبادی پر گہرا طنز ہے۔ یہ کیسی آزادی ہے کہ جب چاہا کمزوروں کے آشیانے پھونک دیے، نہتے آدمی کو قتل کر ڈالا۔ یہاں بے گھری کو آدمی کی من جملہ پریشانیوں اور ہر طرح کے درد وغم کی علامت کے طور پر دیکھا جانا چاہیے

پروانہؔ بے گھری مری قسمت بنی رہی ۔دھرتی سے کٹ گیا کبھی امبر سے کٹ گیا

میری دعائیں سبطین پروانہؔ کے ساتھ ہیں۔اللہ تعالیٰ انھیں ہر جائز کام میں کامیاب کریں (آمین)

☆☆☆

(سبطین پروانہ سے ایک ملاقات کا بقیہ)

جواب۔خوب لکھوں اور پڑھوں اور شاعری کی دنیا میں اپنا نام روشن کروں۔

سوال۔اپنے قارئین کو کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں؟

جواب۔ میں ایک معمولی سا آدمی اور چھوٹا سا شاعر ہوں۔خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ کسی کو کوئی پیغام دوں۔ پھر بھی آپ بضد ہیں تو یہی کہنا چاہوں گا کہ آج ہم جس پر آشوب دور سے گزر رہے ہیں اس کے پیش نظر ضروری ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔اپنے کردار کو مضبوط بنائیں اور فضول کاموں سے پرہیز کریں۔یہی میرا پیغام ہے۔کاش ہمارے نوجوان صراطِ مستقیم پر چل کر اپنے اسلاف کا نام روشن کریں۔

میں آپ کے خیالات سے بے حد متاثر ہوا۔اللہ تعالیٰ سبھوں کو آپ جیسی صالح فکری اور ہمت وحوصلہ عطا فرمائے۔

آخر میں یہ بتا دوں کو سبطین پروانہ سے میں ذاتی طور پر واقف نہیں تھا۔خط وکتابت کے ذریعہ ان کے جو اشعار میرے سامنے آئے ان سے میں بے حد متاثر ہوا۔زندگی کے تمام گوشوں پر اتنی بے خوفی‘ بے باکی‘ برجستگی اور برمحل اشعار انھوں نے کہے ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر‘ادیب اور کاتب بھی ہیں۔ادب کو ہی اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔میری دعا ہے کہ اللہ ان کی ہر نیک تمنا کو پوری کرے۔آمین ☆☆

(ایک تازہ کار شاعر سبطین پروانہ کا بقیہ)

شگفتگی عطا کی ہے۔

سبطین پروانہ کی شاعری میں سہلِ ممتنع کی مسحور کن آواز ہے جس میں شعریت ہے‘ سرشاری ہے‘ وسعت ہے‘ تازہ کاری ہے‘ تیز رفتار عہد کا مشاہدہ بھی ہے۔اور نقد نگاری کی تجزیاتی تصویر کی دل آویز جھلک بھی۔ دعا ہے کہ سبطین کی شاعری کو شرفِ قبولیت ملے۔☆☆☆

(سبطین پروانہ کی شعری انفرادیت کا بقیہ)

دور کے تناظر میں صدفی صد صادق آتے ہیں۔

لبوں پر ہنسی کو تو سب دیکھتے ہیں ۔مرے درد دل کو وہ کب دیکھتے ہیں
جو دیکھا نہیں تھا وہ سب دیکھتے ہیں۔ زمانے کی حالت عجیب دیکھتے ہیں
دل کے ارماں روٹھ رہے ہیں۔ رشتے ناطے ٹوٹ رہے ہیں
جھوٹے وعدے کر کے نیتا۔ جنتا کو اب لُوٹ رہے ہیں

جب ہم ان کے حمدیہ اور نعتیہ کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں اس میں ان کے جذبۂ عبودیت اور عشقِ رسول کی سرشارانہ کیفیت سے دو چار ہوتے ہیں۔قرآن وحدیث کی روشنی میں نعت کہنے کی کوشش کی ہے، اور وہ اس میں
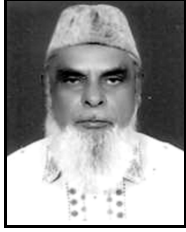
صابر ادیبؔ
۵ ۳۴ر گل کدہ، کچی مسجد، شاہجہاں آباد
بھوپال۔۴۶۲۰۰۱ (مدھیہ پردیش)

سبطین پروانہؔ کی شاعری اوران کی فکری جہات

کامیاب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ؎

ہاتھ آ گیا دامنِ مصطفیٰ۔مجھ کو فردوس کا راستہ مل گیا
آفتابِ حرم کی ملی روشنی۔مرے قلب وجگر جگمگانے لگے

پروانہ صاحب بظاہر غزل کے شاعر ہیں مگر حمد ونعت کے علاوہ پابند نظم اور قطعات بھی بڑی عمدہ کہہ لیتے ہیں۔شعری سفر جاری ہے اور امید ہے کہ آگے چل کر وہ اپنا نام ضرور روشن کریں گے۔شاعر کی حیثیت سے جہاں انھوں نے تخلیقیت کے خوشنما گل بوٹے کھلائے ہیں وہیں بطور شخص اپنی خوش خلقی اور انکساری کے ایسے عمدہ نقوش مرتب کیے ہیں کہ ان کے بعد بھی زمانہ انھیں مدتوں یاد رکھے گا۔انھیں کے اس شعر پر اجازت چاہوں گا:۔

رہے گا یاد پروانہؔ ہمیشہ۔وہ دل میں گھر بنا کر جا رہا ہے☆☆☆

سید غلام سبطین المتخلص سبطین پروانہؔ۔کٹیہار (بہار) کی ایک ایسی ادبی شخصیت ہیں جن کا شعری اثاثہ عزمِ پیہم اور جہدِ مسلسل کے ساتھ یقین محکم جیسے عناصر سے مستحکم ہوا ہے۔یہ بات میں نے اس لئے کہی کہ موصوف دونوں ٹانگوں سے معذور ہیں۔اس معذوری کے باوجود انھوں نے کبھی بھی بے بسی یا لاچاری کا شکار ہو کر قنوطیت کے دامن میں سر نہیں چھپایا بلکہ قناعت اور استقلال کا دامن تھامے ہوئے صبر وشکر کے ساتھ اپنے عزمِ محکم کے سہارے نامساعد حالات سے نبرد آزما رہے اور اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہے۔۔۔۔اور جب اپنی منزل کے قریب پہنچے، تو اپنے ربِّ کائنات کے حضور سجدۂ شکر بجالاتے ہوئے گویا ہوئے:

فکر دے کر تو نے مولا آگہی بھی بخش دی
بندۂ معذور کو بھی کی ودیعت شاعری

گوکہ ان کے گھر کا ماحول ادبی نہ تھا،تعلیم بھی ایسی نہ تھی جس پر فخر کیا جا سکے، پھر بھی غیر متزلزل حوصلہ وہمت کے ساتھ اپنے خاندان کی کفالت کا ذریعہ بھی بنے اور اپنے ذوق وشوق کو پروان چڑھاتے ہوئے کشتِ شاعری کی آبیاری بھی کی۔یہ کوئی معمولی بات نہیں۔اسے ان کے ذوقِ عمل کی انفرادی شان کہا جا سکتا ہے۔

ان کا شعری سفر ۱۹۹۲ء سے جاری ہے۔خواہ وہ حمد ہو،نعت ہو،غزل ہو یا نظم ونثر! کسی بھی صنف میں وہ پیچھے نہیں۔

شاعری دراصل اللہ ربّ العزت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے،وہ بھی ہر کسی کو نہیں بس جس کو عطا ہو جائے۔اس میں معذوری ولاچاری یا کم مائیگی وبے بضاعتی،کسی کا بھی دخل نہیں ہوتا۔

میری شاعری کی اوائل عمری میں میرے ایک بہت ہی قریبی شاعر دوست تھے۔نابینا۔۔۔۔! جن کی دس سال کی عمر میں چیچک کی وجہ سے دونوں آنکھیں جاتی رہی تھیں اور وہ بینائی سے محروم ہو گئے تھے،لیکن شاعری کا ذوق جو انھیں بچپن سے لگ گیا تھا جزو لاینفک بن کر عمر کے آخر تک ان کا ہمدم وہمراز رہا۔ بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔قوتِ احساس اور یادداشت زبردست تھی۔اکیلے باہری کمرے میں

پڑے رہتے تھے۔میں جب بھی ان سے ملنے جاتا تو وہ میرے قدموں کی آہٹ سے مجھ کو پہچان لیا کرتے تھے۔ایک دن میں ان کے پاس کمرے میں بیٹھا تھا۔وہ اپنے نابینا ہونے کی دردناک کہانی سنا رہے تھے۔انھوں نے اپنا ایک شعر سنایا:

تصور سے ہمارا لاکھ دل سرشار ہے لیکن
ہمیں کیا حسرتِ رعنائی عالم نہیں ہوتی

اسی دوران اُن کے والد وہاں سے گزر رہے تھے۔شعر سن کر وہ ایک لمحہ کو ٹھٹکے،ان کی آنکھوں میں بیٹے کی تڑپ وکسک پر آنسو آ گئے۔وہ اپنے آنسو چھپائے ہوئے چُپ چاپ باہر نکل گئے۔

آج قریب پچاس سال بعد بھی یہ شعر مجھے یاد ہے اور اکثر مجھے کچوے بھی لگاتا رہتا ہے۔اس لئے انسان کی معذوری چاہے وہ جسمانی ہو یا ذہنی۔۔۔۔اگر اس کا ذوقِ عمل پختہ اور قوتِ ارادی (will-power) مستحکم ہو تو اس کی منزلِ مقصود کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ ساری جبلّتوں میں قوتِ ارادی کو اوّلیت حاصل ہے۔

اس لئے یہاں یہ کہنا ناگزیر نہ ہوگا کہ فن کار کے خارجی وداخلی تجربات میں اگر شدّتِ احساس ہے تو اس کے اظہار میں کوئی بھی چیز مانع نہیں ہوتی اور یہی چیز وہ قوت ہوتی ہے جو قلب وذہن کو مسحور کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔

شاعری کے لئے اعلا تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ اس کا رشتہ علم سے صرف اتنا ہے کہ علم شاعر کے وجدان کو سنبھالے رہتا ہے۔ اسے شگفتگی و رعنائی عطا کرتا ہے۔ ورنہ حقیقتاً شاعری ہی وجدان کا ''ثمر شیریں'' ہے۔ اس لئے فن کار کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو اگر وجدان کی راہیں کشادہ نہیں ہیں تو وہ صرف علم کے سہارے ہی شعر نہیں کہہ سکتا۔ وجدان ہی شعر کی تخلیق کرتا ہے۔ علم اس میں گہرائی اور گیرائی لاتا ہے۔ سوچ کا کینوس وسیع کرتا ہے۔

سبطین پروانہؔ کے شعری اثاثہ میں سب کچھ ہے۔ انسانی بےضمیری، اخلاقی قدروں کی پامالی، سماجی رشتوں میں عدم توازن، سیاست کی بازی گری، اس کے ساتھ ہی مذہبی نفرت وفساد، نصیحت، محبت، حب الوطنی وغیرہ۔ الغرض انھوں نے نفسِ انسانی کے ہر حرکت وعمل کو شعری جامہ پہنایا ہے جس سے ان کی صلابت فکری کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کے یہ شعر دیکھئے جو میرے دعویٰ کی تصدیق کریں گے:

جن کی تکلیف میں کام آتا رہا تھا میں بھی
وہ پڑوسی ہی مرے گھر کو جلانے نکلے

بیکسوں پہ ظلم ڈھاتے ہو ہمیشہ سوچ لو
لگ نہ جائے تم کو کوئی بددعا دیکھو میاں

دل کے ارماں روٹھ رہے ہیں۔ رشتے ناتے ٹوٹ رہے ہیں

فضاؤں میں ہر سو بھڑکتے ہیں شعلے
یہ جلتے ہوئے بام و در دیکھتے ہیں

بےخطا لوگوں کو اب کٹتے ہوئے دیکھو میاں
نام پر مذہب کے ہے یہ سانحہ دیکھو میاں

اللہ جانے کتنے مرے ہیں فساد میں
اک بھیڑ سی لگی ہے کفن کی دوکان پر

بچے جو نہیں کرتے سلام اپنے بڑوں کو
اب لب پہ بزرگوں کے دعا تک نہیں آتی

جیسے جنت ہو دھرتی پر۔ میرا ہندوستان ہے بابا

شاعری، فنکار کے ذہنی معیار، تفکر اور اس کے تجربات ومشاہدات کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مقصد صرف شاعر یا فن کار کے ذہنی معیار کو پرکھنا نہیں ہوتا بلکہ اس شاعری سے بھی ہوتا جو دلوں کی دھڑکن بن کر سُرور وانبساط بخشے۔ شعور کے دریچوں کو مہکتی ہواؤں سے سرشار کرے۔ رُوح کے رشتوں میں پیوستگی پیدا کرے۔ حتیٰ کہ بھٹکے ہوئے ذہنوں کے لئے رہنمائی کا کام کرے۔ اس تعلق سے ان کے یہ شعر دیکھئے:

پتھر کی چوٹ مجھ کو نہ گھائل بنا سکی۔ لیکن کلیجہ باتوں کے تیور سے کٹ گیا

جو بات تھی عجیب وہی اب ہنر میں ہے۔ لیکن تمیز کس کو یہاں خیر و شر میں ہے

کام میرا ہے دلوں کو جوڑنا اے دوستو!۔ دشمنوں کے درمیاں بھی رابطہ کر جاؤں گا

پروانہؔ دوستو کو کوئی ٹھیس نہ لگے!۔ رکھتا ہوں میں بھی حلقۂ احباب کا خیال

سیکھ کر نکلے گا بچہ پاٹھ شالہ سے ابھی
ساتھ میں وہ قتل وخوں کا سلسلہ لے جائے گا

لیاقت پہ پروانہ کس کی نظر ہے۔ سبھی اب تو نام ونسب دیکھتے ہیں

میں وہاں راستہ بناتا ہوں۔ جب کوئی راستہ نہیں ہوتا

شاعر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا شعر دلوں کے تاروں کو جھنجھنا دے۔ پروانہؔ نے اپنی چھوٹی بحروں کے ذریعہ یہ کام خوب کیا ہے۔ کچھ شعر دیکھئے:

گر نہ جائے یہ ہلکی بوندوں سے۔ جسم کچا مکان ہے بابا

سسکتے ہیں یہاں مظلوم سارے۔ ستم گر گل کھلا کر جا رہا ہے

مفلسی نے لگا دیا خیمہ۔ میرے گھر میں خوشی نہیں آتی

خطا کرتا ہے کوئی اور ہم پر۔ سدا تہمت لگائی جا رہی ہے

جھوٹے وعدے کر کے نیتا۔ جنتا کو اب لوٹ رہے ہیں

فضاؤں میں عجب وحشت ہے طاری۔ یہاں کیسی حکومت آ گئی ہے

رشوت خوری چاروں جانب۔ اپنا ہندوستان بچاؤ

نیتا میں عیاری ہے۔ لاشوں کا بیوپاری ہے

گھومتے ہیں کھلے عام مجرم یہاں۔ ان کو ملتی تو کوئی سزا ابھی نہیں

کام سب کے آسکوں۔ دل کو وہ ارمان دے

شاعر حیات وکائنات کے کرب کو اپنے دل میں محسوس کرتا ہے اور اپنے محسوسات کو اپنے طرز پر شعری لباس عطا کر دیتا ہے۔ اپنے پرائے، اپنی زبان، اپنا وطن اور اپنی ذات تک کو سوچ کا محور بناتا ہے۔ اس ضمن میں یہ چند اشعار پیش ہیں:

اپنی اردو کی شان ہے بابا۔ کتنی میٹھی زبان ہے بابا

جس میں سب خوش حال رہیں۔ ایسا ہندوستان دے

آ گئی ہیں سبھوں میں وہ مکاریاں۔ آج لوگوں میں پہلی شرافت نہیں

مجھ کو دیکھو نہ مشکوک نظروں سے تم
میں ہوں پروانہؔ اتنا برا بھی نہیں

پروانہؔ بےگھری مری قسمت بنی رہی
دھرتی سے کٹ گیا، کبھی امبر سے کٹ گیا

فنکار بڑا حساس ہوتا ہے اور خوددار بھی۔ وہ اپنی کیفیت اور درونِ
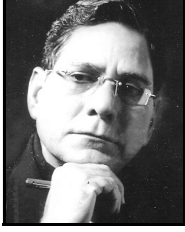
سید نفیس دسنوی
D-205 SECTOR-6
C.D.A. COLONY, BIDANASI
CUTTACK-753014
MOB-09437067585

سبطین پروانہؔ کی تقدیسی شاعری

سبطین پروانہؔ نئی نسل کے ایک ابھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ بہار پٹنہ ایجو کیشن بورڈ سے مولوی کا امتحان پاس کر چکے ہیں۔ والد مرحوم سید نیر اعظم ایک سرکاری اسکول میں سائنس ٹیچر تھے۔ اس طرح دیکھا جائے تو انھیں تعلیمی ماحول ملا ہے۔ اس دینی و تعلیمی ماحول میں ان کی ذہن سازی ہوئی ہے۔ مطالعہ کا بھی ذوق ہے۔ وہ بھی اتنا گہرا کہ جب تک مطالعہ نہ کرلیں رات کو نیند نہیں آتی ہے۔ ان عوامل نے شعر وشاعری کی جانب انھیں مائل کیا، جس کا باقاعدہ آغاز وہ ۱۹۹۲ء سے کر چکے ہیں۔ اصلاحِ سخن کی غرض سے گاہے بگاہے جناب راز ساغری، جناب یونس علی ثمر ماچوی اور جناب عبد الرزاق صابر بھنگوی صاحبان سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

ان کی شاعری پر اظہار خیال سے قبل یہ بتادوں کہ سبطین پروانہ دونوں پاؤں سے معذور ہیں۔ کہیں آنا جانا نہیں۔ بس تعلیم و تعلم اور شعر وشاعری ان کی روزمرہ کی زندگی ہے۔ اپنے گھر میں ایک چھوٹا موٹا سا مدرسہ کھول رکھا ہے جہاں محلے کے بچے بچیاں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو رہی ہیں اور اب مولوی کا امتحان پاس کر لینے کے بعد ایک سرکاری اسکول میں تدریسی فرائض انجام دینے لگے ہیں۔ اپنی معذوری کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ اس نے انہیں تعلیم جیسی بے بہا دولت دی ہے اور تخلیقی صلاحیتوں سے بھی مالا مال کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ انھیں صبر واستقامت عطا فرمائے اور ان کی شاعری قبولِ عام کا درجہ حاصل کرے۔

یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ وہ اپنا نعتیہ مجموعہ "عقیدت کے پھول" شائع کرنے والے ہیں جو "جہانِ نعت" کے مدیر جناب غلام ربانی فداؔ صاحب کے تعاون سے منظرِ عام پر آئے گا۔ اس میں حمد و مناجات کے علاوہ تقریباً ایک سو نعوتِ پاک شامل ہیں۔ اس مجموعے کے لئے انھوں نے مجھ ناچیز سے مضمون کی فرمائش کی تو میں مخمصے میں پڑ گیا اور یہ بات بتادی کہ میرا میدان شاعری ہے اور میں نثر کا آدمی نہیں ہوں۔ کوئی ادیب یا ناقد بھی نہیں کہ ان کی شاعری کا محاکمہ کرسکوں۔ اتنا سننے پر بھی ان کا مسلسل اصرار جاری رہا تو بادلِ ناخواستہ یہ چند سطور تاثرات کے بطور سپردِ قلم کرنے کی جسارت کی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نعت گوئی ایک مشکل فن ہے۔ وہی شاعر اس پل صراط سے بسلامت گزر سکتا ہے جو دینی معلومات اور قرآن وحدیث کی تعلیمات سے بہرہ ور ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ سبطین پروانہؔ ان اوصاف سے متصف ہیں۔ چنانچہ ان کی تقدیسی شاعری رطب و یابس سے پاک نظر آتی ہے۔ ہر قدم پر انھوں نے بڑے احتیاط سے کام لیا ہے۔ ان اوصاف کے علاوہ نعتِ رسول کہنے کے لئے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری محبت و عقیدت، ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی خواہش اور دیدارِ مدینہ کی تڑپ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس سیاق میں جب سبطین پروانہ کی شاعری پر نظر ڈالتا ہوں تو کہنا پڑتا ہے کہ وہ نہ صرف عشقِ رسول کے والہانہ جذبوں سے سرشار ہیں بلکہ سنتِ نبوی پر عمل پیرا بھی ہیں اور دل میں روضۂ سرکارِ دوعالم ﷺ کے دیدار کی تڑپ بھی پائی جاتی ہے۔ چونکہ شعری تجربہ زیادہ نہیں ہے اس لئے لسانی وفنی تسامحات کے امکانات سے گریز نہیں کیا جاسکتا اور سردست ان کے یہاں صلابتِ فکری اور شعری بصیرتوں کی تلاش قبل از وقت ہوگی۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے بصد خلوص واحترام اپنے عقیدت مندانہ جذبات کو شعری پیکر عطا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس مجموعے میں شامل بہت سارے اشعار انجذابِ توجہ کا مرکز بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی ایک مرصع نعتِ پاک کے

ذات کی بکھراؤ ویرانیوں کو لاکھ چھپانے کی کوشش کرے پھر بھی کہیں نہ کہیں اس کی شاعری سے لاشعوری طور پر مترشح ہونے لگتی ہے:۔ مثلاً

مشکلوں میں بھی نہ پھیلایا کبھی دستِ سوال
آج تک باقی ہے یہ شانِ انا دیکھو میاں
اس میں بھی ہوتی ہے پروانہؔ غموں کی سوزش
اب مسرت کے بھی نغمات سے جی ڈرتا ہے
میں ہوں معذور یہ سب کو بتادو
مذاقاً دیکھنا اچھا نہیں ہے

آخر میں انھیں کی اس دعا کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں:

التجا کرتا ہے پراوانہؔ اسے کردے عطا
اے خدا شعر وسخن میں نام وشہرت بے مثال
آمین ثم آمین

☆☆☆

سنہ ۶

عمران راقم

ایڈیٹر صورت۔ کولکاتا

ایک تازہ کار شاعر سبطین پروانہ

چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

رحمتِ عالم نے اچھا کہہ دیا تو ہو گیا
ایک قطرے کو جو دریا کہہ دیا تو ہو گیا
بن گیا صدیق کوئی اور کوئی شیرِ خدا
آپ نے جس کو بھی جیسا کہہ دیا تو ہو گیا
پہلے یثرب تھا مدینہ پوچھئے تاریخ سے
اور یثرب کو مدینہ کہہ دیا تو ہو گیا
کیوں نہیں ہم بھی پڑھیں کلمہ رسول اللہ کا
آپ نے پیتل کو سونا کہہ دیا تو ہو گیا

اب کے عشقِ رسول کی سرشارانہ کیفیت بھی ملاحظہ کریں:

غلامِ مصطفیٰ ہوں اہلِ دنیا کی نگاہوں میں۔ مری پہچان ہے پہچان ہے تسلیم کرتے ہیں

(بقیہ صفحہ 18 پر)

گزشتہ صدی نویں دہائی سے شعری سفر کی ابتدا کرنے والے شاعر سبطین پراوانہ درس وتدریس سے جڑے رہ کر اردو زبان کے فروغ میں سرگرمِ عمل ہیں۔ انھیں کم عمری ہی میں شعر و سخن سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

سبطین پروانہ کا کمال یہ ہے کہ دونوں پیروں سے پیدائشی معذور ہو کر بھی زندگی کو اپنے لیے کبھی بوجھ تصور نہیں کیا۔ بلکہ فنونِ لطیفہ کی تخلیق میں اپنے ذہنی وجسمانی کرب کو چھپانے کی مستحسن کوشش کر رہے ہیں۔ اس حوصلے کے لیے وہ تعریف وتوصیف کے مستحق ہیں۔

اس میں کوئی بعید نہیں کہ لہجے کی انفرادیت اور اسلوب کی تازہ کاری میں انھوں نے دیانت داری سے کام لیا ہے۔ اس لیے خصوصاً غزل کے فن سے انصاف کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شاعری میں وہ فنی لوازمات کے ساتھ لطیف جذبے اور نازک احساسات کو اظہار کا ذریعہ نہیں بنا پائے ہیں۔ لیکن مشقِ سخن کے سفر میں حسبِ توقع بہت ایسے اشعار ان کے یہاں موجود ہیں جن سے پہلو تہی ممکن نہیں۔ جسے انمٹ نقوش کہا جائے۔ پورے طور پر نہ سہی بڑی حد تک ان کی شاعری دل کو چھوتی ہے۔ سبطین پروانہ کی زندگی کا مختصر سا جائزہ لینے کے بعد ان کی شاعری میں پنہاں درد سے آشنائی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شاعری بذاتِ خود رنج وراحت، نشیب وفراز اور شکست وفتح کی حکایت ہوا کرتی ہے جس کا راوی سماج، معاشرہ اور خصوصاً شاعر بھی ہوتا ہے۔ سبطین پروانہ جو زندگی جی رہے ہیں وہ خود بڑی دردانگیز اور عبرت ناک ہے۔ اردو کے پروانے ایسے بھی ہیں جنھیں اپنی جان سے زیادہ اپنے تہذیبی ورثہ کو بچانے کی فکر رہتی ہے۔ سبطین پروانہ کم از کم ان لوگوں سے تو ضرور اچھے اور صحت مند ہیں جن کے دست و پا سلامت تو ہیں لیکن ان کے دل ودماغ کو مغربی تہذیب کے مادہ پرست گندے کیڑوں نے چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کر دیا ہے۔

ان کا اصل نام سید غلام السبطین ہے اور والد کا نام سید نیر اعظم۔ پیدائش کٹیہار کے ایک متوسط تعلیم یافتہ خاندان میں ہوئی۔ پانچ بہن بھائی عہدِ طفلی میں اللہ کو پیارے ہو گیے۔ دو بھائی ایک بہن حیات ہیں۔ ایک بہن بھی مستقل طور پر اعصابی عارضے کی شکار ہے۔

سبطین پروانہ نے ابتدائی دور میں راز ساغری اور یونس علی ثمر مانچوی سے بذریعہ خط مشورۂ سخن کیا۔ ان دونوں اساتذہ کے انتقال کے بعد کسی مقامی شاعر کے تلامذہ میں سے ہیں۔ انھیں میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ فن سیکھنے کے لیے کسی صاحبِ فن سے رجوع کریں۔ ویسے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہوسکتا ہے میری بات سبطین پروانہ سے زیادہ ان کے استاد کو گراں گزرے لیکن سچائی یہی ہے کہ جن کی شاعری خود محتاجِ اصلاح ہے وہ دوسروں کی اصلاح کیا فرمائیں گے۔ جہاں تک سبطین کی شاعری میں کیفیت کی بات ہے ان میں درد وغم کی کسک نمایاں ہے۔ ان کے خیالات ومشاہدات میں جو لفظ اظہار کے پیکر بنے ہیں وہ کلام کے حسن کو نقصان کیے بغیر عوام وخواص میں یکساں مقبول ہوسکتے ہیں۔

سبطین اپنے شعری جملے کی نثری ساخت برقرار رکھنے کی شعوری کوشش کے ساتھ ان کی جائے استعمال کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ انھیں اپنی بات خوبصورتی کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ اسی قدر معلوم ہے جس میں قدامت پسندی کی روایت کا سلسلہ محض دراز نہیں ہوتا بلکہ روایت کے داخلی اور خارجی مکھوٹوں سے باہر نکلنے کی سعی میں چونکانے والی بات بھی پنہاں ہوتی ہے۔ وہ حقیقت پسند سوچ کے مالک ہیں اور ان کا شعری مرقع سیاسی، سماجی، معاشی، اخلاقی اور نفسیاتی مسائل کا آل اندیش مفسر ہے جو عوام الناس کو ایک نئی سوچ اور ذہنی تازگی ضرور

(الحاج) حمید عکسی
H.No:14-6-39,Nizampura
Dist: Warangal-506002(T.S)

سبطین پروانہؔ سے ایک ملاقات

فراہم کرتا ہے۔سبطین پروانہ کی غزلیں بیشتر وقیع اور معیاری رسائل اور جرائد میں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔

سبطین پروانہ کی غزلیں نئے عہد کے تقاضوں کی ترجمانی میں کہیں کلاسیکی انداز کے غیر مانوس طنز کا سہارا لیتی ہیں تو کہیں اشارات و کنایات کے آداب کو حساس پیرہن عطا کرتی ہیں۔شاعری میں روایت کی پاسداری اور اس سے عملی وابستگی جہاں ضروری ہے وہیں زیادہ ضروری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے عہد کے مسائل سے ذائقہ دار ہم آہنگی رکھے۔نئی شاعری اور نئے خیال کا اجمال شاعر کے ذوقِ مطالعہ،وجدانی تخیل،شعورِ فکر،فنکارانہ مزاج و مذاق،اصلاحاتی نظریات پر منحصر ہے جو تنقیدی بصیرت کے نقوش کو معانی و مطالب کی صفات کے ساتھ پیش کرنے کے ہنر سے واقف ہو۔شاید انھیں عوامل کی مستقل مزاجی اور محمول رویّے کی واقفیت نے سبطین پروانہ کی شاعری اور ان کے رخِ حیات کو رعنائی اور

(بقیہ صفحہ 21 پر)

بنا نہیں رہ سکا اور خواہش ہوئی کہ مزید جانکاری کے لیے ان سے ملاقات کی جایے۔دورانِ ملاقات ان سے جو گفتگو ہوئی وہ قارئین کے پیشِ خدمت ہے۔

سوال۔آپ کو شاعری کا ذوق کیسے ہوا؟

جواب۔بچپن سے مجھے گیت،غزل،نعت اور اشعار سننے کا شوق رہا ہے۔میرے ابا حضور کو بھی شاعری بہت پسند تھی۔وہ اکثر غالب،میر اور علامہ اقبال کے کلام کو پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔حالانکہ اس وقت ان اشعار کے معانی و مطالب میرے پلے نہیں پڑتے تھے مگر شعریت کی چاشنی مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔اس کے علاوہ میرے چچا اور دادا بھی ادبی ذوق رکھتے تھے اور ان کے پاس بہت سارے رسائل و جرائد آیا کرتے تھے جن کا مطالعہ میں بڑے ذوق و شوق سے کرتا تھا۔اس طرح میرا ذہن بنتا گیا اور شاعری کے اوزان و بحور کی شد بد بھی ہونے لگی تو خود بھی طبع آزمائی کرنے لگا۔

سوال۔آپ نے اپنے تخلص کے لیے پروانہ کا انتخاب کیوں کیا؟

سبطین پروانہ کا اصل نام سید غلام السبطین ہے۔کٹیہار(بہار) میں ان کی پیدائش ۱۹۷۳ء کو ہوئی۔پٹنہ ایجوکیشن بورڈ سے مولوی کا امتحان پاس کیا اور سرِ دست ایک سرکاری اسکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ان کے والد مرحوم سید نیر اعظم سائنس کے ٹیچر تھے اور والدہ محترمہ سیدہ نفیسہ بانو ایک اچھی خاتونِ خانہ ہونے کے علاوہ بچوں کی تعلیم کا بھی ہمیشہ خیال رکھتی رہی ہیں۔نصف بہتر کا نام ہے یاسمین عرف جاسمین آرا۔چار لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔

سبطین پروانہ کے تعلق سے خاص بات یہ ہے کہ پیدائشی طور پر دونوں ٹانگوں سے معذور ہیں۔اس کے باوجود اللہ کی ذات سے مایوس نہیں۔حوصلہ بلند ہے اور ہمیشہ آگے بڑھنے کا جتن کرتے رہتے ہیں۔چونکہ انھیں گھر کا ماحول تعلیمی ملا اس لئے زیادہ تر وقت مطالعہ اور بچوں کو ٹیوشن پڑھانے میں صرف کرتے ہیں۔مطالعہ کے سبب انھیں شعر گوئی کی تحریک ملی۔۱۹۹۲ء سے باقاعدہ وہ شعر کہنے لگے۔ان کی نعتیں،غزلیں اور نظمیں تواتر سے اخبارات و رسائل کی زینت بن رہی ہیں۔اس طرح ان سے شناسائی کا شرف حاصل ہوا۔اور جب ان کی ذاتی زندگی سے واقف ہوا تو ان کے بلند حوصلوں،ہمت اور لگن کی داد دیے

جواب۔اس کے پیچھے بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔میں بھی ایک انسان ہوں اور میرے سینے میں بھی ایک دل دھڑکتا ہے۔ایسے میں کسی سے اگر عشق ہو جائے تو کوئی چارہ بھی نہیں۔ایک لڑکی سے مجھے بھی پیار ہو گیا۔مگر قسمت نے یاوری نہ کی اور اس سے شادی نہیں ہو سکی۔شمع پر پروانوں کو جلتا دیکھتا رہتا ہوں جو وصالِ یار کی خاطر خود کو دیوانہ وار نچھاور کرتے رہتے ہیں۔ان کے اسی جذبہ نے مجھے پروانہ تخلص رکھنے کی تحریک دی۔

سوال۔میدانِ شاعری میں اترنے سے پہلے آپ کے کیا مشاغل تھے۔

جواب۔خود شاعری کرنے سے پہلے میں اکثر و بیشتر محفلِ میلاد اور دیگر شعری نشستوں میں بڑے شوق سے شریک ہوا کرتا تھا۔اس بات نے بھی مجھے شعر کہنے کی تحریک دی۔مجھ میں خوش خطی کا شوق بھی پیدا ہوا اور کتابت بھی کرنے لگا۔

سوال۔کیا آپ کسی سے اصلاح بھی لیتے ہیں؟

جواب۔ہاں میں کئی اساتذہ سے اصلاح لیتا رہا ہوں۔پہلے جناب راز ساغری پھر جناب سید یونس علی ثمر مانچوی اور دونوں کے انتقال کے بعد جناب صابر بھگوی میرے استاد رہے ہیں۔

سوال۔آپ کے محبوب مشغلے کیا ہیں؟

سـ ۶

ارشد قمر
LalKothiRoad.MuslimNagar
DaltonGanj.Palamu-822101

سبطین پروانہ کی شعری انفرادیت

جواب۔میری اولین ترجیح نونہالانِ ملت کی کردارسازی اور انھیں زیورِتعلیم سے آراستہ کرنا ہے۔اس کے علاوہ شعر وشاعری' کہانیاں لکھنا اور کتابوں کا مطالعہ کرنا میرے مشاغل میں شامل ہیں۔

سوال۔آپ کے پسندیدہ شاعر؟

جواب۔علامہ اقبالؔ مرزا غالبؔ اور میرتقی میرؔ

آپ کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے؟

جواب۔میری کمزوری کتاب ہے۔کوئی بھی کتاب ہاتھ آتے ہی اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔مطالعہ کا اتنا شوق ہے کہ اس کے بغیر رات کو نیند نہیں آتی۔عشاء کی نماز کے بعد مطالعہ کے لیے بیٹھتا ہوں اور اس درمیان موڈ بن جائے تو شعر کہنا شروع کردیتا ہوں۔درمیان میں فون پر دوستوں سے گپ شپ بھی ہوجاتی ہے یا پھر استاد سے مشورۂ سخن کرتا ہوں۔

سوال۔آپ کی دلی تمنا کیا ہے۔

(بقیہ صفحہ 21 پر)

سید غلام السبطین پروانہؔ کٹیہار ضلع کے ایک گاؤں دیلال پور میں یکم اگست ۱۹۸۷ء کو پیدا ہوئے۔ان کی شخصیت ایک حوصلہ مند اور جہد مسلسل والی شخصیت ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں حوصلہ شکنی کی بات نہیں ملتی ہے۔پروانہ صاحب نے جس بلند حوصلہ اور ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے وہ قابل تعریف ہی نہیں قابل دید بھی ہے۔ایک شاعر ہونے کے لیے ایک دردمند دل کا ہونا لازمی ہے تبھی وہ اپنے احساسات وجذبات کو شعری جامہ عطا کرسکتا ہے۔

شاعری کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو ان کی شاعری میں عصری حسیت کے ساتھ اپنے مجروح جذبات کا بخوبی اظہار کیا ہے۔انھوں نے جو کچھ کہا ہے بڑے ہی سہل انداز میں کہا ہے۔انھوں نے اپنے رب کا شکر یہ ادا کیا ہے کہ اس بندۂ معذور کو اس نے ایسی فکروآگہی دی جو بے مثال ہے۔ایک شعر میں انھوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

فکر دے کر تو نے مولا آگہی بھی بخش دی
بندۂ معذور کو بھی کی ودیعت بے مثال

یعنی فکروفن سے مولا نے انھیں بے مثال بنادیا ہے۔زمانے کی نگاہوں کو پروانہ صاحب اچھی طرح سمجھتے ہیں جو کسی کے مجبورومعذور ہونے کا مذاق اُڑاتے ہیں۔وہ اس نظر کو بھی اچھی طرح پہچانتے ہیں مگر اس سے مایوس نہیں ہوتے۔

میں ہوں معذور یہ سب کو بتادو دے۔مذا قاً دیکھنا اچھا نہیں ہے

پروانہؔ صاحب کی شاعری میں اخلاقی قدریں اور روایتیں، انداز بیان اورعصری آگہی اور اپنے اسلاف کی نصیحت آمیز باتوں سے استفادہ کرتے ہوئے ایک اچھی شاعری پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

کبھی کرتا نہیں ایماں کا سودا
ضمیر اپنا ابھی بیچا نہیں ہے

پروانہ دوستوں کو کوئی ٹھیس نہ لگے
رکھتا ہوں میں بھی حلقۂ احباب کا خیال

پروانہ کی شاعری میں کربِ ذات کا اظہار بھی جا بجا ملتا ہے۔وہ جس ملک میں رہتے ہیں وہاں کے رہنے والے لوگوں کے کرب کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ان کے مجروح جذبات کو اپنے شعر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔یہ ملک جمہوری ہونے کے باوجود ہندوستانی حکمران ایک مخصوص قوم کا ملی تشخص مسخ کرنا چاہتے ہیں۔ظلم کے خلاف کوئی آواز اُٹھانے والا نہیں:

بے خطا لوگوں کو اب کٹتا ہوا دیکھو میاں
نام پر مذہب کے ہے یہ سانحہ دیکھو میاں

دوسرا شعر بھی بڑا خوبصورت ہے ملاحظہ کریں:

ریگ صحرا پر پڑی جب ایڑیوں کی ضرب تو
نیم مردہ کو ملا آبِ بقا دیکھو میاں

یہ شعر تلمیح کا ہے۔ابراہیم علیہ السلام کی طرف اشارہ کرکے اپنے فن کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ مظاہرہ کیا ہے۔ایسے بے شمار اشعار ان کی شاعری میں مل جائیں گے جو اپنے دور کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔جب انسان عروج کی زندگی گزارتا اور جب وہ زوال کا مزہ چکھتا ہے تب اس کی زندگی قابل رحم اور عبرتناک ہوجاتی ہے۔ویسے بھی ہر عروج کی انتہا زوال ہے۔ایک شعر کے ذریعہ پروانہؔ اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

سعید رحمانی
مدیرِ اعلیٰ ادبی محاذ۔ دیوان بازار کٹک (اڑیسہ)

کربِ آگہی کا شاعر سبطین پروانہ

ہے چال اس کی اب تو مسلسل ڈھلان پر۔ پرواز جس نے کی
تھی کبھی آسمان پر

آزادی کے بعد ہندوستان میں بالخصوص اقلیت، جس کی زندگی تنگ ہوتی چلی گئی اور یہ سلسلہ ہنوز قائم ہے، اور نہ جانے کب تک قائم رہے گا۔ فساد میں صرف مال ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی بھی خود انسانوں کے ہاتھوں برباد ہونے لگی ہے اور لوگ فسادات میں اتنی تعداد سے موت کا لقمہ بن رہے ہیں کہ کفن کی دکان پر بھیڑ لگ جاتی ہے۔ اس کی تصویر کشی ملاحظہ ہو:۔

اللہ جانے کتنے مرے ہیں ہیں فساد میں۔ اک بھیڑ سی لگی ہے کفن کی دوکان پر

ان کی شاعری میں روایت کی پاسداری کے ساتھ عصرِ حاضر کے سنگین مسائل کی پیش کش ان کی عصری حسیت کا پتہ دیتے ہیں۔ جہاں تک فن کا تعلق ہے تو آہستہ آہستہ فن پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اپنے دل کے ارمان اور دل کی ویرانی کو گلستاں بنا کر طلسماتی رنگ سے اسے شادابی عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری کی ایک اور ایک خوبی یہ ہے کہ ان کے بہت سارے اشعار موجودہ

(بقیہ صفحہ 21 پر)

سبطین پروانہ آج کے ایک جواں فکر شاعر ہیں۔ ۱۹۹۲ء سے شعری سفر جاری ہے۔ شاعری کی عمر کم سہی مگر اس قلیل عرصے میں انھوں نے اچھا خاصا شعری سرمایہ جمع کر لیا ہے جس سے ایک ضخیم مجموعہ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ اساسی طور پر غزل کے شاعر ہیں مگر حمد، نعت و منقبت جیسی تقدیسی شاعری سے بھی ان کو دلچسپی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب وہ اپنا اولین شعری مجموعہ ''دردِ نہاں'' لے کر ہمارے سامنے آرہے ہیں۔

اردو شاعری میں دیگر اصنافِ سخن پر غزل ہی کو فوقیت حاصل ہے اور یہ ہر دور میں سبھوں کی توجہ کا مرکز بنتی رہی ہے۔ اس مقبولیت کی خاص وجہ زبان کی نرمی اور لچک تو ہے ہی ساتھ ساتھ وہ ہر عہد کے سانچے میں بھی آسانی سے ڈھل جاتی ہے۔

اس کے باوجود اس پر اعتراض بھی ہوتے رہے ہیں۔ سب سے پہلے حالی نے اس پر شدید حملہ کیا۔ اگر غزل میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہ رہتی تو یہ بھی قصیدے کی طرح قصۂ پارینہ بن چکی ہوتی۔ اس پر دوسرا حملہ کرنے والوں میں عندلیب شادانی اور کلیم الدین احمد رہے۔ خصوصاً کلیم الدین احمد نے غزل کو غیر مربوط قرار دے کر اسے وحشی صنفِ سخن سے نوازا۔ ان اعتراضات کا تھوڑا بہت اثر غزل پر بھی ہوا۔ غزل کی جگہ غزلِ مسلسل لکھی جانے لگی یا پھر غزل کے عنوان دئے جانے لگے۔ غزل پر تیسرا حملہ ترقی پسندوں کی جانب سے ہوا۔ ان کا اعتراض تھا کہ غزل زوال آمادہ جاگیردارانہ نظام کی علامت ہے۔ اس اعتراض کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں نے نظم کہنی شروع کر دی۔ پھر بھی غزل پر کسی طرح کی آنچ نہیں آئی بلکہ وہ اور بھی طرحدار ہوگئی۔ اس نے بدلے ہوئے حالات کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ نئے نئے استعاروں اور علامتوں کے وسیلے اس میں مزید گہرائی و گیرائی پیدا ہو گئی۔ آج غزل اس قدر مقبول ہوگئی ہے کہ اردو شاعری کی آبرو تسلیم کی جاتی ہے۔

غزل پر اعتراضات اپنی جگہ مگر اس کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ ایک عہد کی غزل میں ایک سے زائد دھارے بہتے نظر آتے ہیں۔ اس کا اندازہ آج کی غزلوں میں بھی لگایا جا سکتا ہے۔ وہ دھارے ہیں کلاسیکی اور نو کلاسیکی، قدیم و جدید یا پھر ان کو روایت وجدت کے خانوں میں رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں عاشقانہ جذبات اور ہجر و وصال کی معاملہ بندی بھی ہے تو تصوف کے مسائل 'زندگی کی حقیقت' احساس محرومی' زمانے کی قہر سامانی اور عصری مسائل جیسے موضوعات بھی

پائے جاتے ہیں۔

اس تمہید سے میری مراد یہ ہے کہ سبطین پروانہ کی غزلیں بھی جہاں ایک طرف وارداتِ حسن وعشق اور ہجر و وصال کا منظر نامہ پیش کرتی ہیں وہیں ان میں عصرِ حاضر کا دل بھی دھڑکتا نظر آتا ہے۔ غالب کو تنگنائے غزل کا شکوہ تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ غزل ہی وہ صنف ہے جس میں انفس و آفاق کے سبھی موضوعات سموئے جا سکتے ہیں۔ یعنی ایک ایسا کوزہ جس میں سمندر کو بند کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس لئے ممکن ہے کہ غزل کی زبان ایجاز و اختصار سے متصف ہے۔ کم سے کم الفاظ میں بڑی بڑی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ یہ ہمیں جہاں کائنات کی سیر کراتی ہے وہیں درونِ ذات اتر کر انسانی جذبات و محسوسات سے بھی آشنا ہونے کا موقع دیتی ہے۔

اس تناظر میں جب ہم سبطین پروانہؔ کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو متعدد اشعار سے ان کے باطنی کرب کا پتہ چلتا ہے۔اس لئے کہا گیا ہے کہ شاعر کی شخصیت اوراس کی شاعری کے درمیان گہرا ربط ہوتا ہے۔شعوری یالاشعوری طور پر اس کے یہاں ایسے شعر بھی وارد ہوجاتے ہیں جن میں اس کے داخلی کرب‘ طبیعت کی حساسیت اور مشاہدات وتجربات کا پورا منظر دیکھا جا سکتا ہے۔اس ضمن میں اشعار پیش کرنے سے پہلے یہ بتادوں کے سبطین پروانہؔ پیدائشی طور پر دونوں ٹانگوں سے معذور ہیں اور بیساکھیوں کے سہارے چلنا پھرنا ہوتا ہے۔اس کے باوجود وہ خدا کی ذات سے مایوس نہیں۔دل میں بلند حوصلہ رکھتے ہیں۔اسی عالم میں انھوں نے تعلیم حاصل کی اور پٹنہ ایجوکیشن بورڈ سے مولوی کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایک سرکاری اسکول میں بطور مدرس ان کا تقرر ہو گیا۔اس طرح اللہ نے ان کے لئے راستہ پیدا کر دیا اور وہ اہل خاندان کی کفالت کے قابل ہو گئے۔شعروشاعری کا شوق بھی بچپن سے تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا اور ۱۹۹۲ء سے وہ باقاعدہ شاعری کرنے لگے۔پہلی غزل بخشیات (کولکاتا) کے ۱۹۹۲ء کے شمارے کی زینت بنی۔پھر انھوں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ان کی نعتیں اور غزلیں تو اتر سے ملک کے مقتدر رسائل کی زینت بننے لگیں جن میں چند نام ہیں:سبقِ اردو، بتول،عبارت، خاتونِ مشرق، چراغِ اردو، زرین شعاعیں، پروازِ ادب، ماہنامہ آندھرا پردیش، گفتگوصورت، ادبی محاذ، گلابی کرن، جامِ شہود، لیکھن یاترا، روپ کی شوبھا، جہانِ نعت، انقلاب، دوران، قومی تنظیم وغیرہ۔ اشاعت کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور ان کی شاعری بتدریج ارتقائی منزلیں طے کرنے لگی ہے۔

بات میں نے شروع کی تھی کہ شاعر کی شخصیت اوراس کی شاعری کے درمیان گہرا ربط ہوتا ہے۔چنانچہ یہاں چند ایسے اشعار پیش ہیں جن سے آپ ان کے جذبات ومحسوسات کا پتہ لگا سکتے ہیں:

میں ہوں معذور یہ سب کو بتادو۔ مذاقاً دیکھنا اچھا نہیں ہے
معذور ہو کے پیدا ہوا اس جہان میں۔ پروانہؔ بھی نصیب کا مارا ہے دوستو
لبوں پر ہنسی کو تو سب دیکھتے ہیں۔ مرے دردِ دل کو وہ کب دیکھتے ہیں
پڑھ کے چہرہ سمجھ لیں حالت کو۔ حال مجھ سے بیاں نہیں ہوتا
مشکلوں میں بھی نہ پھیلایا کبھی دستِ طلب
آج تک باقی ہے یہ شان انا دیکھو میاں
پروانہؔ دوستوں کو کوئی ٹھیس نہ لگے۔ رکھتا ہوں میں بھی حلقۂ احباب کا خیال
میں وہاں راستہ بناتا ہوں۔ جب کوئی راستہ نہیں ہوتا
کام سب کے آسکوں۔ دل کو یہ ارمان دے
سب سے محبت کرتا ہوں۔ مجھ کو تو دیوانہ لکھ
بنی ہیں آئینہ پروانہؔ غزلیں۔ مرے لفظوں میں کربِ آگہی ہے

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد سبطین پروانہؔ کی شخصیت کے تعلق سے ایک ایسے معذور مگر حوصلہ مند انسان کا تصور ابھرتا ہے جو جسمانی کمزوری کے باوجود دل میں خدمتِ خلق کا جذبہ بھی رکھتا ہے، جو ہمدرد بھی ہے اور غیور بھی۔وہ اپنا کرب کسی سے نہیں کہتا‘ البتہ اس کی غزلیں اس کے کربِ آگہی کی آئینہ دار ہیں۔

پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ فی زمانہ غزلوں میں دو دھارے نمایاں طور پر بہتے نظر آتے ہیں اور سبطین پروانہؔ کی غزلوں میں بھی یہ دھارے پہلو بہ پہلو دیکھے جا سکتے ہیں۔روایتی موضوعات کے تحت وارداتِ حسن وعشق اور قصۂ ہجر وصال کو انھوں نے اس طرح شعری زبان عطا کی ہے:۔

یہ بھی سچ ہے کہ تو بے وفا بھی نہیں۔ اور مرے پیار کی انتہا بھی نہیں
میں ہوں کس حال میں اس کو کیا ہو خبر۔ اس کا احساس اس کو ذرا بھی نہیں
ان کا جلوہ دکھا نہیں ہوتا۔ دل اگر آئینہ نہیں ہوتا
نام پروانہؔ گر نہیں رکھتا۔ عشق میں دل جلا نہیں ہوتا
تجھ کو میں دیکھا کروں۔ مجھ کو وہ عرفان دے

یہ ان کے چند جمالیاتی اشعار ہیں اور بڑے مہذب پیرائے میں کہے گئے ہیں۔دراصل یہ ان کا عشق مجازی ہے جو عشق حقیقی کے زینے تک لے جاتا ہے۔مگر ان کی شاعری صرف وارداتِ حسن وعشق تک محدود نہیں بلکہ داخلیت سے خارجیت کی جانب سفر کرتے ہوئے انھوں نے سماجی اخلاقی ،سیاسی اور معاشرتی ناہمواریوں‘ مذہبی تعصب وغیرہ جیسے متنوع موضوعات کو بھی اپنی فکر کا محور بنایا ہے اور اپنے طریقے سے انھیں شعری زبان عطا کی ہے۔ان مختلف موضوعات پر مبنی چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آ گئی ہے تیزی اب چال میں زمانے کی۔ آج کے زمانے میں کاہلوں کا کیا ہوگا
بچے جو نہیں کرتے سلام اپنے بڑوں کو۔ اب لب پہ بزرگوں کے دعا تک نہیں آتی
جو عیب میں تھی بات وہی اب ہنر میں ہے
لیکن تمیز کس کو یہاں خیر وشر میں ہے
آ گئی ہیں سبھوں میں مکاّریاں۔ آج لوگوں میں پہلی شرافت نہیں
سب کے چہرے زرد زرد۔ کتنی کالی رات ہے
رشوت خوری چاروں جانب۔ اپنا ہندوستان بچاؤ
سیکھ کر نکلے گا بچہ پاٹھ شالہ سے ابھی
ساتھ میں وہ قتل وخوں کا سلسلہ لے جائے گا
نیتا میں عیاری ہے۔ لاشوں کا بیوپاری ہے
فضاؤں میں ہر سو بھڑکتے ہیں شعلے۔ یہ جلتے ہوئے بام ودر دیکھتے ہیں
گھومتے ہیں کھلے عام مجرم یہاں۔ ان کو ملتی تو کوئی سزا ابھی نہیں

اس نوع کے ان گنت اشعار ہیں ان سے صرف نظر کرتے ہوئے چند

سبطین پروانہؔ کی شعری کائنات

ایسے حمدِ باری تعالیٰ اشعار کا حوالہ دینا چاہوں گا جن سے

دکھائیں گے پُرکیف منظر جہاں کو۔ طلسماتی ہر سو فضا کرنے والے
ریگِ صحرا پر پڑی جب ایڑیوں کی ضرب تو۔ نیم مردہ کو ملا آبِ بقا دیکھو میاں
کیسے انصاف پاؤ گے پروانہؔ تم۔ اب وہ فاروقؓ جیسی عدالت کہاں
ان کی شاعری کا کینوس بے حد وسیع

ان
کی

مالکِ دنیا ہے تیری بادشاہت بے مثال
جس کو چاہے دیدے ذلت یا کہ عزت بے مثال
باغ میں یہ برگ و گل اور رنگ و نکہت بے مثال
ہے تری تخلیق نادر اور حکمت بے مثال
چاند تارے رات کو دیتے ہیں اپنی روشنی
دن میں روشن مہرِ تاباں، تیری قدرت بے مثال
ایک لفظِ کُن سے پیدا کردیا مخلوق کو
ذرّے ذرّے سے عیاں ہے شانِ رفعت بے مثال
ہم کو بینائی عطا کی اور خرد گویائی بھی
شکر کس کس کا کریں ہم، تیری نعمت بے مثال
فکر دے کر تونے مولا آگہی بھی بخش دی
بندۂ معذور کو بھی کی ودیعت بے مثال
التجا کرتا ہے پروانہؔ اسے کردے عطا

حمدِ باری تعالیٰ

لب پر حمدِ باری ہے
وجد کی حالت طاری ہے
تیرے کرم کے سائے میں
زیست ہماری جاری ہے
دینِ نبی کے گلشن میں
رحمت کی گل کاری ہے
تو ہی داورِ محشر ہے
تیرے کرم کی باری ہے
میرے لب پر کلمہ ہو
جانے کی تیاری ہے
تم نے کہی پروانہؔ جو
حمد بہت ہی پیاری ہے

نعتِ پاک

شکر ہے وہ حبیبِ خدا مل گیا
سارے عالم کا وہ رہنما مل گیا
ہاتھ میں آگیا دامنِ مصطفیٰؐ
مجھ کو فردوس کا راستہ مل گیا
نام سے جس کے طوفان رخ موڑ دے
میری کشتی کو وہ ناخدا مل گیا
عاصیوں کی شفاعت کا مژدہ لیے
وہ شفیع ہم کو روزِ جزا مل گیا
رہنمائی ثمرؔ کی جو حاصل ہوئی
نعت کہنے کا پھر حوصلہ مل گیا

نعتِ پاک

جو دیارِ محمدؐ کو جانے لگے
مرتبہ اپنا وہ بھی بڑھانے لگے
آفتابِ حرم کی ملی روشنی
میرے قلب و جگر جگمگانے لگے
اور منظر ہمیں کوئی بھایا نہیں
سبز گنبد پہ دل ہم لٹانے لگے
میرے آقا کا ہے یہ بھی اک معجزہ
کلمہ کنکر بھی پڑھ کر سنانے لگے
بزم میں بندھ گیا اک انوکھا سماں
نعت پروانہؔ جب بھی سنانے لگے

فکر اسلامی مترشح

ہے۔ بہت سے گوشے رہ گئے

ہے۔ ان اشعار میں تلمیحات کا برملا استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔
وہ صحرا کو اپنا مکاں کرنے والے۔ وہی ریت کو گلستاں کرنے والے

غزلیات

ہیں جن پر پھر کبھی گفتگو ہوگی۔ ایک بات ہے کہ ان کی شاعری کی عمر بہت
کم ہے، اس لئے ان کے اشعار میں وہ صلابت فکری اور بالیدہ شعور نہیں

یہ بھی سچ ہے کہ تو بے وفا بھی نہیں
اورمرے پیار کی انتہا بھی نہیں
زخم ایسا دیا اس نے حیرت میں ہوں
درد دل میں تو میرے میں اٹھا بھی نہیں
میں ہوں کس حال میں اس کو کیا ہو خبر
اِس کا احساس اُس کو ذرا بھی نہیں
گھومتے ہیں کھلے عام مجرم یہاں
ان کو ملتی تو کوئی سزا بھی نہیں
مجھ کو دیکھو نہ مشکوک نظروں سے تم
میں ہوں پروانہؔ اتنا برا بھی نہیں

لوگ جو باکمال ہوتے ہیں
اصل میں لازوال ہوتے ہیں
لوگ کرتے ہیں تعریفیں ان کی
کام جب بے مثال ہوتے ہیں
میں بھلا کیا جواب دوں ان کا
کتنے مشکل سوال ہوتے ہیں
روبرو میری چشمِ بینا کے
ان کے حسن و جمال ہوتے ہیں
دوست پروانہؔ ان کو کرتا ہوں
جو مرے ہم خیال ہوتے ہیں

ان کا جلوہ دکھا نہیں ہوتا
دل اگر آئینہ نہیں ہوتا
غم کو جب مہماں نہیں کرتا
دکھ کا تحفہ ملا نہیں ہوتا
غم بھی دیتا ہے ذائقہ مجھ کو
سب کو لیکن پتہ نہیں ہوتا
کتنے احسان رب کے ہم پر ہیں
شکر لیکن ادا نہیں ہوتا
نام پروانہؔ گر نہیں رکھتا
عشق میں دل جلا نہیں ہوتا

رہزن سے کوئی اور کوئی رہبر سے کٹ گیا
''اپنا گلا تو پیار کے خنجر سے کٹ گیا''
جو کٹ سکا نہ ظلم کی تلوار سے وہی
شیشے سے، مے سے، مینا سے ساغر سے کٹ گیا
پتھر کی چوٹ مجھ کو نہ گھائل بنا سکی
لیکن کلیجہ باتوں کے تیور سے کٹ گیا
آندھی کے تیز جھونکے مجھے زخم دے گئے
میری خوشی کا پیڑ تھا وہ جڑ سے کٹ گیا
پروانہؔ بے گھری مری قسمت بنی رہی
دھرتی سے کٹ گیا کبھی امبر سے کٹ گیا

سنہ ۶

غزلیات

پیدا ہوسکا ہے جوایک کہنہ مشق

ہے چال اس کی اب تو مسلسل ڈھلان پر
پرواز جس نے کی تھی کبھی آسمان پر
اللہ جانے کتنے مرے ہیں فساد میں
اک بھیڑ سی لگی ہے کفن کی دکان پر
جتنا بھی آزمائیں مرے ظرف کو مگر
میں کامیاب اتروں گا ہر امتحان پر
در بھی کھلا رہے گا جناب آپ کے لئے
موجود مجھ کو پائیں گے ہردم مکان پر
شہرت کی جس بلندی پہ تو ہے کھڑا ہوا
پروانہؔ ہم بھی تھے کبھی اس آسمان پر

شعر کے لفظوں کو آئینہ بنا کر جاؤں گا
اس میں چہرہ ساری دنیا کا دکھا کر جاؤں گا
کام میرا ہے دلوں کو جوڑنا اے دوستو!
دشمنوں کے درمیاں بھی رابطہ کر جاؤں گا
میں دکھاتا ہی نہیں لوگوں کو کوئی سبز باغ
میں نے جو وعدے کئے ان کو نبھا کر جاؤں گا
اپنی دنیا اک سرائے کی طرح ہے دوستو!
یہ حقیقت سارے لوگوں کو بتا کر جاؤں گا
میرے بچے شاد ہوں دنیا میں پروانہؔ سدا

وہ مجھ پر رحم کھا کر جا رہا ہے
مرے دل کو دکھا کر جا رہا ہے
خریدے گا ضمیر آکر وہ میرا
ابھی قیمت لگا کر جا رہا ہے
بڑے آرام سے جو سو رہے تھے
انھیں طوفاں جگا کر جا رہا ہے
سسکتے ہیں یہاں مظلوم سارے
ستم گر گل کھلا کر جا رہا ہے
رہے گا یاد پروانہؔ ہمیشہ

بے خطا لوگوں کو اب کٹتا ہوا دیکھو میاں
نام پہ مذہب کے ہے یہ سانحہ دیکھو میاں
بے کسوں پر ظلم ڈھاتے ہو ہمیشہ سوچ لو
لگ نہ جائے تم کو کوئی بددعا دیکھو میاں
ریگِ صحرا پر پڑی جب ایڑیوں کی ضرب تو
نیم مردہ کو ملا آبِ بقا دیکھو میاں
مشکلوں میں بھی نہ پھیلایا کبھی دستِ طلب
آج تک باقی ہے یہ شانِ انا دیکھو میاں
عیب جوئی کرنا چاہو تم اگر پروانہؔ تو
پہلے جاکر اپنے گھر میں آئینہ دیکھو میاں

شاعر
میں
ہوتا
ہے

لبوں پر ہنسی کو تو سب دیکھتے ہیں
مرے دردِ دل کو وہ کب دیکھتے ہیں
جو دیکھا نہیں تھا وہ اب دیکھتے ہیں
زمانے کی حالت عجب دیکھتے ہیں
برائی کی جانب تو جاتے ہیں سب ہی
بھلائی ہو جس میں وہ کب دیکھتے ہیں
وہ اندر سے لیکن بڑا نرم خو ہے
کہ چہرے پہ جس کے غضب دیکھتے ہیں
لیاقت پہ پروانہؔ کس کی نظر ہے

وہ صحرا کو اپنا مکاں کرنے والے
وہی ریت کو گلستاں کرنے والے
دکھائیں گے پرکیف منظر سبھوں کو
طلسماتی ہر سو سماں کرنے والے
بنادی ہے شاداب نفرت کی وادی
وہ دریائے الفت رواں کرنے والے
دیا حوصلہ سارے لوگوں کو آکر
امنگوں کو دل میں جوان کرنے والے
جو دیتے ہیں پروانہؔ دردِ جدائی
علاج محبت کہاں کرنے والے

دل کے ارماں روٹھ رہے ہیں
رشتے ناطے ٹوٹ رہے ہیں
جھوٹے وعدے کرکے نیتا
جنتا کو اب لوٹ رہے ہیں
پتھر کے بازار میں دیکھو
کتنے شیشے ٹوٹ رہے ہیں
میں نے کھولی پول جو اس کی
ہاتھ سے طوطے چھوٹ رہے ہیں
شمعِ الفت سے بھی اب تو
پروانے سب روٹھ رہے ہیں

اپنی اردو کی شان ہے بابا
کتنی میٹھی زبان ہے بابا
ایک مفلس کو ہے پریشانی
گھر میں بیٹی جوان ہے بابا
سب کی بگڑی جو وہ بناتا ہے
رات دن اس کا دھیان ہے بابا
گر نہ جائے یہ ہلکی بوندوں سے
جسم کچّا مکان ہے بابا
جیسے جنت ہو کوئی دھرتی پر
میرا ہندوستان ہے بابا

اپنے ایمان کی دولت کو بچائے رکھنا
جو ہے حق بات اسے لب پہ سجائے رکھنا
اپنے ہمسائے کو تکلیف نہ ہونے پائے
اپنے اس فرض کو ہر حال نبھائے رکھنا
خون انصاف کا ہرگز نہیں ہونے پائے
سونے چاندی سے نہ مجرم کو بچائے رکھنا
جس کا سایہ مرے ہمسائے کے گھر تک پہنچے
اک گھنا پیڑ بھی آنگن میں لگائے رکھنا
گھر کی ہر بات کو تم دل میں رکھو پروانہؔ

جو عیب میں تھی بات وہی اب ہنر میں ہے
لیکن تمیز کس کو یہاں خیر و شر میں ہے
بھولا نہیں ہوں میں تری تیکھی زبان کو
پیوست جو ابھی تلک میرے جگر میں ہے
مجھ کو ملا نہ ساتھ کسی کا یہ غم نہیں
سایہ ہی میرے ساتھ ہمیشہ سفر میں ہے
گرویدہ مجھ کو جس نے کیا تھا حیات میں
وہ یاد بن کے آج بھی دل کے نگر میں ہے

زرد موسم آئے گا پتہ ہرا لے جائے گا
میری خوشیوں کا بھی ہر اک سلسلہ لے جائے گا
سیکھ کر نکلے گا بچہ پاٹھ شالہ سے ابھی
ساتھ میں وہ قتل و خوں کا مشغلہ لے جائے گا
تیرگی کا راہ زن مارے گا شب خوں اس طرح
ساتھ اپنے روشنی کا قافلہ لے جائے گا
مشکلوں کا زرد موسم آئے گا جب اس طرف
میرے جینے کا وہ ہر اک مرحلہ لے جائے گا
یاس کا لشکر ہے پروانہؔ نظر کے سامنے
میرے دل سے زندگی کا حوصلہ لے جائے گا

دل میں میرے کسی سے عداوت نہیں
دشمنوں سے بھی کوئی شکایت نہیں
وہ ہے نا آشنا اپنی تہذیب سے
جس کی باتوں میں کوئی نفاست نہیں
دشمنی پہ کمر بستہ رہتے ہیں سب
دوستوں کے دلوں میں وہ الفت نہیں
آ گئی ہیں سبھوں میں وہ مکّاریاں
آج لوگوں میں پہلی شرافت نہیں
کیسے انصاف پاؤ گے پروانہؔ تم

سنہ ء

منتخب اشعار

میں ہوں معذور یہ سب کو بتادو۔ مذا قاً دیکھنا اچھا نہیں ہے
کبھی کرتا نہیں ایماں کا سودا۔ ضمیر اپنا ابھی بیچا نہیں ہے
لبوں پر ہنسی کو تو سب دیکھتے ہیں۔ مرے کربِ دل کو وہ کب دیکھتے ہیں
لیاقت پہ پروانہؔ کس کی نظر ہے۔ سبھی اب تو نام ونسب دیکھتے ہیں
وہ صحرا کو اپنا مکاں کرنے والے۔ وہی ریت کو گلستاں کرنے والے
دکھائیں گے پُرکیف منظر سبھوں کو۔ طلسماتی ہر سو فضا کرنے والے
گھومتے ہیں کھلے عام مجرم یہاں۔ ان کو ملتی تو کوئی سزا ابھی نہیں
غم بھی دیتا ہے ذائقہ مجھ کو۔ سب کو لیکن پتہ نہیں ہوتا
پتھر کی چوٹ مجھ کو تو گھائل نہ کرسکی۔ لیکن کلیجہ باتوں کے تیور سے کٹ گیا
جتنا بھی آزمائیں مرے ظرف کو مگر۔ میں کامیاب اتروں گا ہر امتحان پر
کام میرا ہے دلوں کو جوڑنا اے دوستو!۔ دشمنوں کے درمیاں بھی رابطہ کر جاؤں گا
سسکتے ہیں یہاں مظلوم سارے۔ ستم گر گل کھلا کر جا رہا ہے
بے خطا لوگوں کو اب کٹتا ہوا دیکھو میاں۔ نام پر مذہب کے ہے یہ سانحہ دیکھو میاں
ریگِ صحرا پر پڑی جب ایڑیوں کی ضرب تو۔ نیم مردہ کو ملا آبِ بقا دیکھو میاں
مشکلوں میں بھی نہ پھیلایا کبھی دستِ طلب۔ آج تک باقی ہے یہ شانِ انا دیکھو میاں
آگئی ہے تیزی اب چال میں زمانے کی۔ آج کے زمانے میں کاہلوں کا کیا ہوگا
خطا کرتا ہے کوئی اور ہم پر۔ سدا تہمت لگائی جارہی ہے
کرم یہ بھی ہے اپنے رہنما کا۔ مری بستی جلائی جارہی ہے
رشوت خوری چاروں جانب۔ اپنا ہندوستان بچاؤ
پروانہؔ دوستوں کو کوئی ٹھیس نہ لگے۔ رکھتا ہوں میں بھی حلقۂ احباب کا خیال
جھوٹے وعدے کر کے نیتا۔ جنتا کو اب لوٹ رہے ہیں
جیسے جنت ہو کوئی دھرتی پر۔ میرا ہندوستان ہے بابا
اس میں بھی ہوتی ہے پروانہؔ غموں کی سوزش۔ اب مسرت کے بھی نغمات سے جی ڈرتا ہے
بچے جو نہیں کرتے سلام اپنے بڑوں کو۔ اب لب پہ بزرگوں کے دعا تک نہیں آتی
فضاؤں پر عجب دہشت ہے طاری۔ یہاں کیسی حکومت ہوگئی ہے
میں وہاں راستہ بناتا ہوں۔ جب کوئی راستہ نہیں ہوتا
جو عیب تھی بات وہی اب ہنر میں۔ لیکن تمیز کس کو یہاں خیر وشر میں ہے
جن کی تکلیف میں کام آتا رہا تھا میں بھی۔ وہ پڑوسی ہی مرے گھر کو جلانے نکلے
آگئی ہیں سبھوں میں وہ مکاریاں۔ آج لوگوں میں پہلی شرافت نہیں

ملکِ ادب کی جن محترم شخصیتوں سے میرے بالمشافہہ یا مراسلاتی سطح پر برادرانہ تعلقات استوار ہیں یہ گوشے والا شمارہ انھیں حضرات کے نام معنون ہے۔ ان کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں
(سبطین پروانہ)

جناب الحاج اجمل عزیزی صاحب
جناب مسعود عبیدی صاحب
جناب اعجاز انجم صاحب
جناب کلام اجنبی صاحب
جناب اشتیاق فیضی صاحب
جناب نادر جمالی صاحب
جناب علی حسن صاحب
جناب نور مشہد میکش صاحب
جناب خورشید انجم صاحب
جناب عبدالغفار بہتر صاحب
جناب ارشد رضا پروانہ صاحب
جناب احمد رضا فاضل صاحب
جناب غلام سرور ہاشمی صاحب
جناب نورالدین ثانی صاحب
جناب احمد ندیم مورسنڈوی صاحب
پروفیسر انور ایرج صاحب
جناب ارمان الباری صاحب
جناب علی رضا رہبر صاحب
جناب انور ریاض صاحب
جناب قاری نثار شمس صاحب
جناب شمیم دارا صاحب
جناب شمیم راحت صاحب
جناب معظم علی صاحب
جناب جاوید اجملی صاحب
جناب ریحان عالم صاحب

ڈاکٹر فضلِ احمد صاحب
جناب افضل غزالی صاحب
جناب واصف رشیدی صاحب
جناب نور محمد صاحب
جناب سہیل اختر صاحب
جناب عطا عابدی صاحب
جناب ممتاز نیّر صاحب
جناب قمر تاباں صاحب
جناب سید نفیس دسنوی صاحب
جناب قیصر امام صاحب
جناب شاہنواز عالم صاحب
جناب محمود عالم صاحب
جناب فتح الباری صاحب
جناب غلام علی اخضر صاحب
جناب ناصر فراز صاحب
جناب مصداق اعظمی صاحب
جناب مرغوب اثر فاطمی صاحب
جناب رہبر گیاوی صاحب
جناب چونچ گیاوی صاحب

سماجی سچائیوں کا نباض' فطری افسانہ نگار۔۔۔۔۔۔شہاب دائروی

۔انھیں اس بات کا اعتراف بھی ہے۔ بہت سی کمیاں رہ گئی ہیں جس کا احساس کر کے وہ کہتے ہیں:

جتن اس کی کرتا ہوں میں شاعری میں۔ کہیں مجھ سے سرزد خطا ہو نہ جائے

بہرحال یہ ان کی شاعری کا پہلا پڑاؤ ہے۔ دوسرے پڑاؤ پر پہنچنے کے لئے ابھی انھیں لمبا سفر طے کرنا ہے۔ اگر مشق و مزاولت اسی طرح جاری رہی تو مستقبل میں ان سے بہتری کی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

مجموعی طور پر ان کی غزلوں میں روایتی اسلوب، فکری اخلاص، جرأتِ اظہار، حق بیانی، جدید حسیت، سماجی شعور اور مذہب وعقیدہ جیسے اوصاف سے ایک ایسی تاثراتی فضا استوار ہوتی ہے جس سے امکانات کے در وا ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آگے چل کر شاعری کی دنیا میں وہ اپنا نام روشن کریں گے۔☆☆☆

قاضی مشتاق احمد کا تازہ ترین سماجی وجذباتی ناول

درد کا پیوند منظرِ عام پر

قیمت۔۱۰۰/روپے

تقسیم کار:۔رحمانی پبلی کیشنز۔انصاری روڈ۔اسلام پورہ

مالیگاؤں۔423203(مہاراشٹر)موبائل۔9270704505

عصرِ حاضر کے معروف ومستند ہمہ جہت شاعر وادیب عبدالمتین

جامیؔ کے مضامین کا مجموعہ

نئی تنقیدی جہات

منظرِ عام پر

صفحات۔۱۹۲/ قیمت۔۲۸۰/روپے

رابطہ۔اردو بازار۔ڈاکخانہ پدماپور۔ضلع کٹک۔754200(اڑیسہ)

ڈاکٹر خان رضوان احمد نقی
508۔ مادھونگر، بھیونڈی (مہاراشٹر)

میری نظر میں قاضی مشتاق احمد

راقم پوری اردو دنیا کی بات نہیں کر رہا، نہ ہی ہندوستان کے پورے ادبی منظر نامے پر روشنی ڈالنے کا ارادہ ہے، اس جگہ اردو فکشن کے حوالے سے صرف ارضِ بہار کا ذکر مقصود ہے۔ فی زمانہ جب ہندوستان میں افسانہ، ناول لکھنے والوں کی تعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے، دبستانِ عظیم آباد میں مرد اور خواتین تخلیق کاروں کی اتنی بڑی تعداد نظر آتی ہے جس کی نظیر کسی اور اُردو خطے میں موجود نہیں ہے۔ یہاں فکشن نگاروں کی جو تین پیڑھیاں سرگرم عمل ہیں ان میں ایسے کہنہ مشق بزرگوں کے نام بھی نمایاں ہیں جنھوں نے گزشتہ نصف صدی پرورش لوح قلم میں گزاری ہے۔ ان میں اکثر عالمی اردو ادب میں اپنا مقام متعین کر چکے ہیں۔ لیکن سینئر قلم کاروں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو بدلتے وقت میں شہرت و منزلت حاصل کرنے کے فن سے نا آشنا صرف اپنی تخلیقی دنیا میں کھوئے رہے اور اس میدان میں ہم سفروں سے بڑی حد تک پچھڑ گئے۔ ایسے ہی پیچھے رہ جانے والوں میں ایک نہایت اہم نام شہاب دائروی کا بھی ہے جن کی تخلیقات پچھلے پچاس برسوں سے مسلسل شائع ہوتی رہی ہیں۔ قارئین میں مقبول بھی ہوئیں لیکن انھیں ان کا وہ مقام نہیں ملا جو ملنا چاہئے تھا۔ ایسا کیوں ہوا' اس ضمن میں عہد کے معتبر و دانشور جناب منظر کلیم کا حقیقت افروز تجزیہ ہے کہ "رومانیت سے لے کر حقیقت نگاری تک اور علامت نگاری سے کہانی پن تک افسانے کا ایک لمبا سفر ہے۔ افسانے کے اس لمبے سفر میں فن کاروں میں مسافت کی کامیابی اور تھکن دونوں دکھائی دیتی ہیں۔ کئی قلم کار ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن گئے اور بہت سارے گمنامی میں چند قارئین اور ناقدین کے بے توجہی کا شکار ہو گئے۔ انھی میں ایک نام شہاب دائروی کا ہے۔ شہاب دائروی کا تعلق افسانہ نگاروں کی اس نسل سے ہے جو ایک زمانہ میں صوبہ بہار کی نمائندگی ملک گیر پیمانے پر کر رہا تھا۔ کسی نے عہدے کا سہارا لے کر، کسی نے تعلقات کی سیڑھی لگا کر اپنی ادبی دستار بندی کرائی جو چند ایک فطری طور پر فن کار تھے وہ بے نیاز رہے۔ یہی بے نیازی شہاب دائروی کو کھا گئی۔ ادب میں نیاز مندوں کے لئے تو جگہ ہے لیکن بے نیازوں کے لئے نہیں اور جب بے نیازی حد سے گزر جاتی ہے تو فن کار کو حاشیے پر کھڑا کر دیتی ہے۔"

شہاب دائروی 1964-65ء سے مسلسل افسانے لکھ رہے ہیں۔ اب تک وہ سو سے زیادہ افسانے تخلیق کر چکے ہیں جو 'شمع' اور 'بیسویں صدی' سمیت ہند و پاک کے مقبول جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے اکثر افسانے بہت مشہور ہوئے ہیں۔ جیسے 'میں کیا کروں'، گہرا، لوٹن، شہتوت، کھردرے ہاتھ، بڑے میاں، عورت، پرانا اور نیا ہندوستان، فضلو بابا، ثبوت کوئی ثبوت، رشتے کی کڑیاں، حادثہ، جرم، انسانیت، ٹوٹے سپنے، امن کا پہلا پڑاؤ، ڈیڈسی، چڑیلیں، ابلیس اور فرشتہ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ شہاب دائروی کا تخصص اور انفرادیت ہے یا ان کی کمزوری کہ وہ ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت وغیرہ تحریکوں اور ادلتے بدلتے تصنیفی رویوں اور طریقوں سے الگ اپنے رنگ ڈھنگ کے ساتھ سماج اور زندگی کے اپنے تجربات و مشاہدات کو کہانی میں بیان کرتے رہے۔ ان کے یہاں اس انسانی معاشرے کی بھرپور ترجمانی موجود ہے جس میں انھوں نے زندگی کی ہے، ان کی کہانیوں میں ان دیکھا اور جانا پرکھا سچ پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتا ہے اور قاری کے ذہن کو اپنے گرفت میں لے لینے کی قوت رکھتا ہے۔ شہاب صاحب کی افسانہ نگاری پر نامور ادبی مصاحبہ نگار نثار احمد صدیقی کا یہ مطالعہ ان کا بہترین تعارف ہے:

’’شہاب دائروی کے افسانے پڑھ کر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے ہیں، ان کی سوچ میں بلا کی پاکیزگی ہے، ان کے افسانوں میں صداقت ہے حقیقت سے لبریز جیتے جاگتے خوبصورت کردار ہیں۔تحریر میں بے پناہ روانی، شگفتگی، طرز زندگی میں رکھ رکھاؤ اور معاشرت میں حسن پسندی اور سلیقہ شعاری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔علاوہ ازیں آپ حساس طبیعت کے مالک ہیں، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر آپ کی گرفت بڑی مضبوط اور مشاہدہ بہت تیز ہے۔معتبر افسانہ نگار کی جملہ صفات شہاب دائروی کے یہاں یقینی طور پر ملتی ہیں۔اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ افسانے لکھنے میں گزار چکے ہیں۔ہاں یہ بات صحیح ہے کہ ان کے افسانے پرانی روش کے ہی ہوتے ہیں، انھوں نے کبھی تحریک یا رجحان کے تحت افسانہ نہیں لکھا، انھوں نے نئی نسل کے شانہ بشانہ چلنا بھی مناسب نہیں جانا، روایت کی شاہراہ اپناتے ہوئے دُکھ درد کی کہانی کو افسانوی رنگ دیتے رہے۔لیکن اپنے چند افسانوں کا مواد انھوں نے قدیم ہندوستانی تہذیب اور دیومالا سے بھی لیا ہے۔خوبی یہ ہے کہ وہ اس مواد کو عام فہم معنویت سے ہم کنار کر کے عصر حاضر سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔انھوں نے عوامی زندگی اور اس کے سروکاروں کا بھی گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ان کی چند کہانیوں کے کردار اور واقعات تہذیبی روایت وعقائد کی دوامی حقیقت کا اثبات کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔عام انسانی سرگرمیاں اور فطرت کا حسن شہاب دائروی کی کہانیوں کا جوہر ہے۔یہ اپنے مشاہدے کی بوقلمونی کی مدد سے فطرتِ انسانی کے جذبۂ خیر پرت اپنے تعین کامل کا بے محابا اظہار ایک خاص بزرگانہ انداز میں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔فرض شناسی اور بے نیازی ان کی کہانیوں کی مخصوص قدریں ہیں۔سمرسٹ مام نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ’’فکشن کے مطالعے میں وطن کو خاص اہمیت ہے۔اگر ایسا افسانہ نگار اس خوبی سے عادی ہے تو وہ بے کار، اس کے موضوع اور اندازِ بیان میں مقبولیتِ عام کا وہ جوہر جس سے دانشور اور نقاد طبقہ سے لے کر برتن دھونے والے اور ٹرک ڈرائیور تک بخوبی دلچسپی لے سکیں‘‘۔سمرسٹ مام کے ان الفاظ کا اطلاق شہاب دائروی کے تقریباً سب ہی افسانوں پر ہوتا ہے۔ان کے افسانوں سے ایک برتن دھونے والے سے لے کر دانشور تک محظوظ ہوتا ہے، پھر انھیں افسانوی ادب میں مقام کیوں نہیں دیا گیا؟ سوال اٹھتا ہے کہ انھیں کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے، کسی نے ذکر بھی کیا ہے تو سرسری طور پر کیا۔کیا ذکی انور کے سب ہی افسانے نمبرون کے تھے؟ کیا کرشن چندر کے افسانے سبھی صفِ اول اور معیاری افسانے کہے جا سکتے ہیں؟ پھر شہاب دائروی کے ساتھ ایسا کیوں کیا گیا‘‘۔(شہاب دائروی کی کہانی ’مہرباں‘ کا ایک جائزہ)

نثار احمد صدیقی کا یہ سوال اپنی جگہ درست ہے کہ شہاب دائروی کے ساتھ ایسا کیوں کیا گیا؟ سیدھا سا جواب یہ ہے کہ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہو رہا ہے کہ اکثر فن کاروں کو ان کا صحیح مقام نہیں ملتا، لیکن یہ بھی ہے کہ اگر فن میں خوبی ہے تو دیر سویر دنیا اس کی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔شہاب دائروی دیر سے سہی لیکن مشاہیر اور مقتدر اربابِ علم و ادب کی توجہ کا مرکز ضرور بن چکے ہیں۔ان کے چار افسانوی مجموعے ’میں کیا کروں، پلاسٹک کا انسان، ڈیڈسی، اور شہتوت، انھیں ایک معتبر افسانہ نگار ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

سید شہاب الدین (شہاب دائروی) نورتن بادلی، بہار شریف میں دسمبر 1944ء میں پیدا ہوئے۔ان کے والد علاقہ کے زمیندار تھے۔انھوں نے رسمی تعلیم صرف انٹرمیڈیٹ تک حاصل کی۔افسانوں اور ناولوں کے مطالعے کا شوق تعلیم کے زمانہ سے ہی لکھنے کی طرف کھینچ چکا تھا۔لیکن انھوں نے اپنے فن کو پیشہ نہیں بنایا۔انھوں نے تجارت کا راستہ اختیار کیا۔سائنسی آلات اور کیمیائی اشیاء کے کامیاب تاجر ثابت ہوئے۔چونکہ علاقہ دائرہ بہار شریف میں مستقل سکونت تھی اس لئے شہاب دائروی کے نام سے افسانے لکھنے لگے۔یہ ان کی خوش نصیبی ہے کہ ان کی شادی 1969ء میں مہرا، ضلع لکھی سرائے کے سید محمد شاکر صاحب کی صاحبزادی عشرت آرا سلطانہ سے ہوئی۔عشرت آرا صاحبہ کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ذوق وشوق کی تکمیل شادی کے بعد ہوئی جس میں ان کے رفیق سفر شہاب دائروی نے اہم کردار ادا کیا۔محترمہ نے 1974ء میں نالندہ کالج سے بی اے آنرز کرنے کے بعد مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے 1977ء ایم اے (فرسٹ ڈویژن) اور پھر 1983ء میں عصمت چغتائی ساجی شعور (ناول کی روشنی میں) کے عنوان سے تحقیقی مقالہ پیش کر کے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔1978ء میں نالندہ مہیلا کالج بہار شریف کے شعبۂ اردو میں لکچرر مقرر ہوئیں۔1997ء میں رانچی

سلیم انصاری (جبلپور)
Mob-7070135643

مشروط واپسی

میں اب بھی
بچپنے کی سمت واپس لوٹ سکتا ہوں
مگر اک شرط ہے
یہ سرحدِ امکان تک پھیلا سمندر
وقت کے ساحل پہ بکھری سیپیاں واپس کرے مجھکو
گھنا جنگل
مرے ہاتھوں کی ساری تتلیاں واپس کرے مجھکو
امنگوں کی پتنگیں آسماں واپس کرے مجھکو
میں اب بھی دوڑ سکتا ہوں
مخالف سمت اپنی عمر کے لیکن
مرے معصومیاں تو چھین لی ہیں
وقت کے بے رحم ہاتھوں نے
مگر میں اب بھی
بچپنے کی سمت واپس لوٹ سکتا ہوں
مگر شاید۔۔کہ
خالی ہاتھ واپس لوٹنا اچھا نہیں ہوتا۔۔۔

چاند اکبر (جرنلسٹ)
H.No:4-515, Lower Lane
Snagtrashwadi.Gulbarga-585101
موبائیل:۔ 94485 7746

میدان طنز ومزاح کا آئیکون۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔منظور وقار

یونیورسٹی سے پروفیسر وہاب اشرفی مرحوم کی نگرانی میں ''عصر حاضر میں غالب کی معنویت'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے ڈی لٹ کیا۔ اپنے کالج میں ریڈر اور پھر پروفیسر ہو کر درس وتدریس کی اعلیٰ خدمات انجام دے رہی ہیں۔ پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ''عصمت چغتائی کا سماجی شعور'' اور ڈی لٹ کا مقالہ '' عصر حاضر میں غالب کی معنویت'' کتابی صورت میں شائع ہو کر ارباب نقد ونظر کی توجہ کا مرکز ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں نالندہ ضلع کی خدمات ابتدا تا 2000ء تک پروفیسر عشرت آرا کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے جسے انھوں نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے خصوصی پروجیکٹ کے طور پر مکمل کیا۔ اپنے رفیق حیات شہاب دائروی کے افسانے اور تجزیے خاص اہمیت کی حامل ہے جس میں شامل اہل نقد ونظر کی آراء شہاب صاحب کے فن کو سمجھنے اور تعین قدر کا بڑا وسیلہ ثابت ہوئی ہیں۔ گزشتہ سال 2016ء میں پروفیسر عشرت آرا سلطانہ نے ''شہتوت'' کے عنوان سے شہاب دائروی کے 26 منتخب افسانوں کا خوبصورت مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

''حرف حرف حقیقت'' کے عنوان سے کتاب کے پیش نامہ میں پروفیسر صاحبہ رقم طراز ہیں:

''یادش بخیر، جب شہاب دائروی کے افسانے ہند و پاک کے مقتدر رسائل میں شائع ہوتے تو ان کے قارئین کا ایک گروپ تھا جو نہایت وسیع تھا اور قریب ہر روز قارئین کے خطوط آتے رہتے تھے۔ جس سے آپ کی اور آپ کے فن پارے کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارا دل اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکا کہ آج بھی وہ یادیں ذہن کے دریچے پر رقص فرما ہیں۔ لیکن شہاب دائروی نے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ آپ ایک بلند پایہ افسانہ نگار ہیں۔ آپ کی منکسر المزاجی اور خاکساری ہی آپ کی شناخت رہی جس کے لئے آپ کی جس قدر پذیرائی کی جائے وہ کم ہے''۔

اس منتخب افسانوی مجموعے کی وقیع تقریظ میں جناب بے نام گلانی نے مرتب کتاب کی ستائش کرتے ہوئے چند افسانوں کے اقتباسات درج کرتے ہوئے شہاب دائروی کے فنی رویوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی بہترین کوشش کی ہے۔

''شہتوت'' میں شامل افسانوں کے متعلق کچھ رقم کرنے سے قبل یہ ناچیز اس میں شامل افسانوں کے کچھ اقتباسات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہے تا کہ قاری خود فیصلہ کر سکے کہ یہ افسانے معیار واقدار اور افکار وخیالات کے اعتبار سے کتنے کامیاب ہیں۔ ان کی فنی وحسّی حیثیت کیا ہے۔ یہ کس قدر ہمارے معاشرے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ کس طرح حقائق سے قریب ہیں اور ان کا کیا معیار واقدار ہے۔ ان کے اجزائے ترکیبی کس حد تک میزان افسانہ نگاری پر کھرے اُترتے ہیں اور ان میں کتنی پائیداری واستحکام ہے۔ نیز اس قسم کے بہت سارے اُمور ہیں جن کے متعلق کوئی فیصلہ افسانوں کے مطالعہ کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اقتباسات کے ذریعہ بھی کچھ نہ کچھ تو کہا اور سمجھا ہی جا سکتا ہے۔

افسانہ ''شہتوت کا اقتباس'':۔ '' پروفیسر نہیں چاہتے کہ تم اس سے ملو، اور تمھیں ان کی چاہت کا احترام کرنا ہو''

''میں خود اب اس کو لفٹ کہاں دیتی ہوں آپا۔۔۔'' سلمہ نے کہا'' وہ تو کب کا قلاش ہو کر میرے لئے مر گیا''۔

''ونڈر فل'' پروفیسر کھلکھلا کر ہنس پڑے اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے سیسہ پگھلا کر میرے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔ میرے دماغ کی ساری رگیں پھٹنے لگیں اور میں ریلنگ کا سہارا لے کر سنبھلتا لوٹ گیا''۔

''پلاسٹک کا انسان'' سے:۔ ساتھیو! ہم ہمیشہ عوام کو تاریکی میں بٹھا کر انھیں اسکرین پر روشن راہیں دکھاتے ہیں اور عوام سنیما ہال میں ہماری روشن راہوں کو دیکھ کر اپنے دلوں کی گہرائیوں میں جھانکتے ہیں، سر دھنتے ہیں، نادم بھی ہوتے ہیں اور افسوس بھی کرتے ہیں، پر جوں ہی سنیما ہال سے نکلتے ہیں ہماری دکھائی ہوئی روشن راہیں بھول جاتے ہیں۔ صرف ہمیں یاد رکھتے ہیں، ہماری اداؤں کی نقل کرتے ہیں، ہماری جوانیوں پر سوچتے ہیں، اسی وجہ سے میں بالکل تاریکی میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنے گھروں میں پہنچ کر صرف میری باتوں پر سنجیدگی سے غور کر سکیں''۔

افسانہ ''من کی بھوک'' سے:۔ وہ اس کی نگاہوں میں غیر مرد کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کافی ہاؤس میں داخل ہوئی تھی۔ اس کا شوہر بھی کافی ہاؤس میں داخل ہو رہا تھا۔ لیکن بالکل انجان سا بنا کافی پی کر وہاں سے نکل گیا تھا اور وہ غیر مرد کے ساتھ مسکراتی ہنستی ہوئی بیٹھی شوہر کے بے تعلق ہو کر جاتے ہی اس طرح یکا یک اُداس تھی جیسے وہ آسمان کو چھونے کا جتن کرتے کرتے گر کر لہولہان وہ گئی ہو۔ اس رات وہ ساری رات اضطراب کی لہروں میں تیرتی بے چین رہی تھی اور اسی شام گھر آتے ہی وہ پتھر اس سے بول پڑا''۔

جیسا کہ قبل بھی راقم الحروف یہ رقم کر چکا ہے کہ اس کتاب میں کُل 26/ افسانے ہیں اور سبھوں کے اقتباسات محض ایک تذکراتی مضمون میں شامل کرنا طوالت کا پیش خیمہ ہوگا۔ اس لئے اب ضروری یہ ہے کہ ان اقتباسات کے عوامل اور نتائج و اثرات پر کچھ باتیں ہوں متذکرہ افسانوں کے اقتباسات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا

ہے کہ یہ تمام افسانے ہمارے معاشرے ہی کے اصل ترجمان ہیں۔ کہانیاں جداگانہ ہیں‘ پلاٹ بھی جدا ہے لیکن ان سبھوں کا مرکزی خیال کم و بیش ایک ہی ہے کہ معاشرے میں پھیلی برائیوں مثلاً تکبر، احساس برتری، ہوس کاری، جنسی تلذذ، غیر رواداری اور غیر مساویانہ رویہ جو اس معاشرے کے لئے کل بھی زہر ہلاہل کا حکم رکھتے تھے آج بھی یکساں طور پر رکھتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ بھی اس کی حیثیت اسی طرح کی رہے گی کیونکہ اس کے تدارک کے لئے ایک نئی تحریک کی ضرورت پیش ہے۔ ایک ایسی تحریک جو معاشرے میں بھونچال پیدا کر دینے والا انقلاب پیدا کر سکے لیکن اس وقت مایوسی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ جب ذہن میں یہ حقیقت گردش کرنے لگتی ہے کہ دور دور تک کوئی محرک نظر نہیں آتا ہے۔ گو کہ اس امر میں بھی کوئی اشکال نہیں کہ انقلاب آج بھی رونما ہو رہے ہیں لیکن صد افسوس کہ یہ مثبت نہ ہو کر منفی رُخ اختیار کئے ہوئے ہیں جس طرح روایتی تہذیب و تمدن، اخلاقی قدروں کو اہلِ معاشرہ مغرب پرستی سے متاثر ہو کر اپنے قدموں تلے روندر ہے ہیں‘ وہ باظرف انسان کے لئے نا قابلِ برداشت ہیں۔ اسی مغرب پرستی نے ایک انسان سے انسانی اوصاف کو چھین رکھا ہے۔

شہاب دائروی کے افسانے فکشن مروجہ معیارات کے تحت کس خانے میں رکھے جانے کے قابل ہیں یہ اربابِ نقد و نظر جانیں لیکن ایک عام قاری کی حیثیت سے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شہاب صاحب عام انسانوں کی زندگی کے نباض اور فطری افسانہ نگار ہیں۔ بقول پروفیسر علیم اللہ حالی ”شہاب دائروی نے افسانوی ادب میں جو قابل قدر اضافہ کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا، ان کے تمام افسانے ہر عہد میں یاد رکھے جائیں گے۔

شہاب دائروی سنجیدہ مزاج اور منکسر المزاج انسان ہیں۔ وہ ہمیشہ سے علمی و ادبی مسابقت آرائی اور نظریاتی گروہ بندی سے مجتنب رہے۔ ان کی نجی زندگی مطمئن اور خوشحال ہے۔ ان کے لائق فرزند محمد فرزیں شہاب مکینکل انجینئر ہیں، بہو دیبا فرزیں بھی ماشاء اللہ الکٹرانک انجینئر ہیں۔ خدا نے انھیں پانچ بیٹوں سے نوازا ہے۔ پورا گھرانہ اردو زبان، ادب اور جدید علوم کی روشنی سے منور ہے۔ شہاب دائروی کا تخلیقی و تصنیفی سفر جاری ہے۔ ان کی بیگم پروفیسر عشرت آرا سلطانہ صاحبہ بھی تحقیق، تنقید اور درس و تدریس میں سرگرم ہیں۔ مستقبل قریب میں دونوں کی نئی نگارشات منظر عام پر آنے والی ہیں۔☆☆☆

کم گو، دور اندیش، معاملہ فہم قاضی مشتاق احمد ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ ایک سبکدوش سرکاری افسر کے علاوہ نامور ادیب اور اچھے خصائل کے انسان بھی ہیں۔ آپ کے افسانے، سماجی ناہمواریوں پر چوٹ کرتے ہیں تو مضامین خواب خرگوش سے بیدار کرتے ہیں۔ حالات حاضرہ پر گہری نظر، سیاسی بصیرت، آپ کے

یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ خود کو قلم اور کتاب کے لئے وقف کر دیا ہے۔ قاضی صاحب کے قول و فعل میں تضاد ہرگز نہ رہا۔ بہت بڑے ادیب، اعلیٰ خیالات‘ انسانیت‘ ہمدردی‘

رواداری، قومی یکجہتی کا راگ الاپتے ہیں مگر جب ان کے ذاتی کوائف معلوم ہوتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے۔ جیسی فکر و خیالات کی دنیا ہم نے قاضی صاحب کے یہاں دیکھی وہ بہت کم دیکھ سکے۔ انھوں نے ادبی جھگڑوں، گروہ بندی، بغض و حسد اور شہرت سے خود کو کوسوں دور رکھا۔ ان کے خاکے میں پروفیسر ظفر احمد نظامی رقمطراز ہیں:

”کتابی چہرہ آنکھوں پر پہرہ، دراز قد، سنجیدہ خال و خد، کشادہ پیشانی ذہانت کی نشانی، ستواں ناک، گفتگو میں انہماک، بڑے بڑے کان عظمت کی پہچان، یہ ہیں نامور کہانی کار، ممتاز ناول نگار، جریدوں کے قلمی مدیر، دل کی دنیا کے امیر، مشہور کالم نگار، اردو ادب کا اعتبار، ممتاز ڈراما نویس، شہر افسانہ کے رئیس، بے شمار اداروں کی شان، ان گنت تنظیموں کی جان، دنیائے ادب میں معتبر اور مستند یعنی قاضی مشتاق احمد۔ جلگاؤں کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ وہاں ۲۰/ مارچ ۱۹۴۰ء کو قاضی مشتاق احمد کی ولادت ہوئی۔ ان کے جد امجد عربی فارسی کے عالم تھے، واقعتاً عروج کی زبان میں بحر سالم تھے۔ سلطان پور کے قاضی و انعامدار رہے، قوم کا اعتبار و اعتماد رہے۔ کاتب قرآن و مترجم قرآن تھے۔ اہل علم و صاحب ایمان تھے۔ والد عدلیہ سے وابستہ رہے، فروغ اردو پر کمر بستہ رہے۔ اپنے زمانے کے مزاح نگار تھے۔ مالکِ شخصیتِ باغ و بہار تھے۔ مشتاق صاحب نے دینی تعلیم گھر میں پائی۔ پھر دانش گاہوں سے لو لگائی، معاشیات و سیاسیات سے مدد لی، امتیازی حیثیت سے سند لی۔ مہاراشٹر ایڈ منسٹریٹیو سروس میں منتخب ہوئے، ریاست کے لئے افتخار کا سبب ہوئے۔ مختلف عہدوں کو عزت بخشی، ملک و قوم کو محبت بخشی۔ سب سے پہلے تحصیلدار رہے، پھر ڈپٹی کلکٹر جیسے ذمہ دار رہے۔ بمبئی کے ایڈیشنل کلکٹر ہوئے۔ سماجی بہبودی کے ڈائریکٹر ہوئے۔ آخر سرکاری ملازمت سے روپوش ہوئے۔ ۱۹۸۸ء میں سبکدوشی ہوئی۔ بعد ازاں پونے والوں کو اپنایا۔ پونے کو ہی اپنا وطن بنایا“۔

قاضی مشتاق احمد کے مضامین، افسانے، ڈرامے، ناول خوب پڑھے جاتے ہیں۔ ڈرامے کے شائقین آپ کا نام دیکھ کر ڈرامے دیکھنے کا من بناتے ہیں۔ آئیڈیا، جو مجیب خاں صاحب کا ڈرامہ گروپ ہے اسے آپ نے اپنے ڈرامے دیئے جس نے بمبئی، پونے اور مہاراشٹر کے دوسرے علاقوں میں کامیاب شوز کیے ہیں۔

ابتدائی سرگرمیاں:۔ ”روزنامہ انقلاب“ بمبئی کے بچوں کے صفحے سے ادبی کیریر کا آغاز ہوا۔ طالب علمی کے زمانے میں پہلی کتاب ”زندہ مورتی“ شائع ہوئی۔ روزنامہ ”ہندوستان“ بمبئی میں ایک مستقل کالم بعنوان ’جائزے‘ مسلسل چار سال تک

ڈاکٹر سید غلام ربانی ایاز سمبلپوری
E.A.C .Colony.Behind Court
Raipur-492001(C.G)
Mobile:08305893443

منظر اعجاز کا رنگِ سخن

لکھا۔اسی اخبار میں نیوز اڈیٹر مقرر رہوئے۔ماہنامہ ''صبحِ امید'' کے ادارتی شعبہ سے منسلک رہنے کے بعد ہفت روزہ ''نئی روشنی'' میں ادارت کے فرائض انجام دیے۔ماہنامہ ''گونج'' نظام آباد میں ایک مستقل کالم 'یادیں' باتیں' ملاقاتیں' روزنامہ ''انقلاب'' اور ''اردو ٹائمز'' بمبئی میں مضامین شائع ہوتے ہیں۔ماہنامہ ''بیباک'' مالیگاؤں میں مستقل کالم 'نوکِ خار' ماہنامہ ''رنگ'' دھنباد میں خود نوشت ''صبح روز آتی ہے'' قسط وار شائع ہوتی رہی ہے۔

اعزازات و انعامات: مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو ساہیتہ اکیڈمی سے انعامات (۱) فٹ پاتھ کی رانی ۱۹۸۲ء (ناول)، (۲) شہزادہ ۱۹۸۵ء (ناول)، (۳) نیا کلینڈر ۱۹۹۲ء (بچوں کا ادب)، (۴) درد کی زبان ۱۹۹۸ء (افسانوی مجموعہ)

مغربی بنگال اردو اکیڈمی سے انعام: (۱) درد کی زبان ۱۹۹۸ء (افسانوی مجموعہ)

خصوصی شمارے اور گوشے: ماہنامہ اسباق، پونہ۔ماہنامہ 'انتساب' سرونج۔سہ ماہی ''رنگ'' دھنباد۔ماہنامہ 'شاعر' بمبئی۔ہفت روزہ 'گونج' نظام آباد۔ماہنامہ 'گلہائے خنداں' رامپور۔ماہنامہ 'بیباک' مالیگاؤں۔

یونیورسٹی سطح پر مقالے: راقم الحروف نے ''قاضی مشتاق احمد کی ڈرامہ نگاری'' پر ایم فل (اردو) کی ڈگری حاصل کی۔ڈاکٹر محمد عبدالقدیر نے قاضی مشتاق احمد: شخصیت اور کارنامے، کے عنوان سے مقالہ لکھ کر یونیورسٹی آف حیدرآباد سے ''قاضی مشتاق احمد: افسانہ نگار: مقالہ لکھ کر ایم۔فل (اردو) کی ڈگری حاصل کی۔

دیگر خدمات: قاضی صاحب مہاراشٹر اردو اکیڈمی کے رُکن اور دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ پونہ کی مجلسِ عاملہ کے رُکن اور کلچرل کمیٹی کے صدر رہے۔مختلف شہروں میں کئی اہم ادبی اجلاس، سیمینار، جلسوں اور ورکشاپ میں شرکت کی۔

اسفار: برطانیہ، سوئزرلینڈ، جرمنی، اٹلی، فرانس، ہالینڈ، برسلز، ویٹی کن سٹی اسٹیٹ، تھائی لینڈ، سنگاپور، سعودی عرب، کراچی، ماریشش، دبئی۔

دیگر انعامات و اعزازات: راشٹرپتی میڈل (سرکاری ملازمت میں)۔سماجی برائیوں سے جنگ کے لئے ۲۰۰۰ء میں گوڈ فرے فلپس انڈیا ایوارڈ۔مدھیہ پردیش کی گنجن منچ سے ایوارڈ ملا۔پونے میونسپل کارپوریشن کی جانب سے 'پونے شہر کی مقبولیت میں اضافہ کرنے والی ہستی' کا اعزاز ملا۔راشٹریہ ودینان منچ نے 'سد بھاونا پرسکار' دیا۔شعبہ انسدادِ منشیات میں خصوصی خدمات کے لئے پونے میونسپل کارپوریشن کا ایوارڈ۔طویل ادبی خدمات کے لئے 'اسباق سلور ٹرافی'۔ان کے علاوہ کئی قابل قدر انعامات حاصل ہوئے۔

فن و شخصیت پر کتب: ڈاکٹر عبدالقدیر کے پی ایچ ڈی مقالے پر مبنی کتاب 'قاضی مشتاق احمد: شخصیت اور کارنامے'۔نذیر فتح پوری کی کتاب ''اردو افسانے کی مقبول ترین آواز'' قاضی مشتاق احمد۔روی بھوشن کی انگریزی کتاب 'ریفرنس ایشیا' (جس میں ایشیا کی ان شخصیات کا ذکر ہے جنھوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی) میں قاضی صاحب کا تعارف مع تصویر (صفحہ ۱۸۷)

بچوں کا ادب: (۱) زندہ مورتی (۲) چندا ماما کے گاؤں میں (۳) نیا کلینڈر (۴) سچی کہانیاں (۵) بچوں کی رامائن (۶) مہابھارت کی کہانیاں (۷) کامیاب افسانوں کی کہانیاں (۸) باتیں دین کی (۹) یورپ کی سیر (۱۰) حکایتِ ہستی (۱۱) پہلی غلطی (۱۲) بھوتوں کی کہانیاں (۱۳) شہزادی پری زاد موت کی وادی میں (۱۴) گیارہ عظیم ہستیاں۔

ہندی میں افسانوی مجموعے: (۱) ایک ہی راستہ (۲) جل سے بوجھل بدلی (قومی اعزاز اور ایک لاکھ روپے کا انعام) (۳) کہانی ختم ہوئی (منشی پریم چند ایوارڈ)۔

رپوتاژ: (۱) داستان اس بے وفا کی۔

دو/تین ایکٹ کے ڈرامے (اسٹیج کے لئے): (۱) ایک اور سپر اسٹار (۲) آتشِ کشمیر (۳) میڈم انارکلی (۴) گوہر جان کا شوہر (۵) بے نام رشتے (۶) مرزا غالبؔ کی حویلی (۷) آزاد کا خواب: ہندوستان کی آزادی (۸) آخری مغل (۹) سُونیتا (۱۰) ایک لڑکی بھولی بھالی سی (۱۱) شہید بھگت سنگھ (۱۲) مہاتما جیوتی راؤ پھولے (۱۳) ہماری پیاری زبان اردو (۱۴) چاہوں گا میں تمھیں شام سویرے۔(گلوکار محمد رفیع کی زندگی پر مبنی) (۱۵) طفلی ڈرامے۔

سوانحی خاکے: (۱) خوشبو جیسے لوگ (۲) لوگ آسان سمجھتے ہیں منوّر رہونا (منوّر پیر بھائی کی زندگی پر مبنی)

سماجی/رومانی ناول: (۱) ایک دل ارمان بھرا (۲) شہزادہ (۳) آزادی (۴) فٹ پاتھ کی رانی (۵) سہمی ہوئی بہار (۶) خوشبو کا سفر۔

مہمّاتی ناول: (۱) دھوئیں کا قتل (۲) موت کی لاش (۳) روح کا قتل (۴) دشمن کے دوست (۵) مقتول کی گواہی (۶) سرخ نشان (۷) خطروں کے خریدار (۸) قتل کی رات۔

افسانوی مجموعے: (۱) صحبت کی خوشبو (۲) درد کی زبان (۳) وفا کے رنگ (۴) لکشمن ریکھا کے پار (۵) خواب بھی بکتے ہیں (۶) تتلیاں آزاد ہیں (۷) دل کے

سلگنے کا سبب۔

تحقیق وتنقید: (۱) ''اردو شاعری: میرؔ سے پروین شاکرؔ تک''۔ نارتھ مہاراشٹر یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب (بی اے تھرڈ ایئر میں شامل) (۲) اردو شاعری: کل، آج اور ہمیشہ (۳) اردو نثر: ایک مطالعہ (۴) خاندیش: تاریخی تہذیبی ادبی مطالعہ (۵) پونے ہے جس کا نام (۶) اردو اور مراٹھی کے ادبی وثقافتی رشتے (۷) مضامین نو: جدید ادبی فکر (مہاراشٹر اردو اکادمی اور اتر ہردیش اردو اکادمی کے انعامات)

سفرنامے: (۱) جس نے یورپ نہیں دیکھا (امبیڈکر یونیورسٹی، حیدرآباد کے نصاب برائے ترجمہ وصحافت میں شامل) (۲) آٹھ سفرنامے۔

افسانے: ملک کے مقبول جرائد میں تین سو سے زائد افسانے شائع ہوئے۔ ان میں سے بیشتر افسانوں کے ترجمے ہندی، انگریزی، مراٹھی، گجراتی، تیلگو اور دوسری زبانوں میں ہوئے۔

فلمیں: پونے کے فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ نے دو فلمیں قاضی مشتاق احمد کی کہانیوں پر بنائیں۔☆☆☆

آلہ ایجاد ہوا ہوتا تو وثوق سے یہ کہنا ہمارے لئے ممکن ہوجاتا کہ میدان طنز ومزاح کے شہسوار منظور وقار کی تخلیقی قوتِ پرواز سری ہری کوٹہ یا ناسا کے خلائی اسٹیشن سے داغے جانے والے عصری راکٹ کی قوت رفتار سے کہیں زیادہ تیز تر ہے۔ چلو اچھا ہی ہوا اس زودنویس مزاح نگار کی تخلیقی قوتِ پرواز ایک ادنیٰ مشینی آلہ کی رہین منت اور احسان مندی سے محفوظ و مامون تو رہی۔

منظور وقار بے تکان لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ زودنویسی ان کا طرہ امتیاز ہے۔ بقول جواں سال ممتاز مزاح نگار مرحوم امجد علی فیض ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منظور وقار کی ایک انگلی میں نہیں ہر انگلی میں ایک قلم ہے۔'' منظور وقار کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا وصف یہ ہوتا ہے کہ وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں اس کا مکمل احاطہ کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ دنیائے ادب کی اس سدابہار تنگڑی ہستی کے قلم کی برق رفتاری دھیمی اور مجہول پن کا کبھی شکار نہیں رہی۔ ان کے قلمی جہاد کا جوش جنون سر چڑھ کر بولتا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ اپنی فنی جولانیوں کے نت نئے جلوے دکھاتے ہوئے ادبی معرکہ آرائی سے فتوحات کے ریکارڈ قائم کرتے جارہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے فنی کمالات اور زودنویسی کے ریکارڈ کو توڑنے کی کبھی کسی نے ہمت جٹائی اور نہ ہی اس جری قلمی پہلوان کو پچھاڑنے کی جسارت کی تاہم اپنے شاندار ریکارڈ کو وہ خود ہی توڑتے ہوئے زودنویسی کے ہمالیائی پرچم لہرانے میں ہردم کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے فکروفن کا شہرہ انفارمیشن ٹکنالوجی کی معرفت ملکی سرحدوں کے پار تک پھیل گیا ہے۔

دو مقبول عام تصانیف ''ہنسا منع ہے''، ''کانٹوں کا جھنڈ'' اور 25/ مضامین پر مشتمل زیر طبع انشائیوں کا مجموعہ ''پڑھنا منع ہے'' کے خالق منظور وقار طنز و مزاح کے تیز طرار تیرونشتر چلانے کا باکمال ہنر خوب جانتے ہیں۔ ان کا ولولہ انگیز قلم فنی امتیازات وعظمتوں کے نت نئے گوہر نایاب ڈھونڈ نکال لاتا ہے جسے دیکھ کر اہل قلم انگشت بدنداں ہیں۔ منظور وقار اپنے مضامین یا کہانی کا پلاٹ اپنے اردگرد کے ماحول، واقعات، حادثات اور حقائق سے منتخب کرتے ہیں۔ ان کے اندر کا فن کار کبھی مغرور نہیں ہوا بلکہ اس میں مزید انکساری پیدا ہوئی ہے۔ یہی انکساری وحلیمی ان کی سوچ وفکر کو بھرپور انداز میں صحیح اور صحت مند بناتی ہے۔ منظور وقار کا بیانیہ اسلوب سپاٹ اور اتنا

سیدھا سادا کہ ''تیرے دل میں اُتر جائے میری بات'' کے مصداق عام قاری کو کسی الجھن میں مبتلا کئے بغیر فکری احساس کے ساتھ لطف اندوزی کے مواقع عطا کرتا ہے۔ طنز ومزاح سے مزین ان کے بیشتر دلچسپ مضامین طوالت کے باوجود قاری ایک ہی نشست میں بار بار پڑھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ طنز ومزاح کے اس مرد مجاہد پر شیریں زبان اردو خوب نازاں و شاداں ہے۔ ملک کے مختلف گوشوں سے شائع ہونے والے اردو اخبارات، رسائل وجرائد

تخلیقی قوتِ پرواز کی وسعتوں کو تعین کرنے کے لئے سائنٹفک پیمائشی

سنہ ۶

رؤف خوشتر
موظف پرنسپال سرکاری کالج، بیجاپور
09538445870

خاکہ

دریافت والا شخص

ماہنامے اور خصوصی نمبر وغیرہ ان کی بیش بہا نگارشات کو اپنے دامن میں سموئے پھولے نہیں سماتے۔ گزشتہ چار دہائیوں سے ہندو پاک کی ادبی وادیوں کو ان کے رشحات قلم نے فکر و فن کی بھینی بھینی خوشبوؤں سے مہکا کر معطر کئے رکھا ہے۔

سادگی کا پیکر منظور وقار میدان طنز مزاح کا آئیکون بن چکے ہیں۔ اہل اردو انہیں قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی سادہ لوحی اور معصومانہ روش ہر ایک کو خوب بھاتی ہے۔ یہ ایسے فطری باکمال فن کار ہیں جو گروہ بندیوں کی بندشوں سے آزاد ہیں۔ باہمی محبت و اُلفت' جذبہ ایثار و قربانی' ہمدردی و سچائی اور دیانت داری ان کی گھٹی میں سرایت کر چکی ہے۔ انسانیت نواز اس البیلے فن کار نے اپنی حیات کے طویل تر دورانیہ میں خوش گوار دوستانہ مراسم قائم رکھنے کو ہمیشہ فوقیت دی ہے۔ سوچ و فکر اور نازک خیالی کے ذریعہ بھی کسی ادنیٰ و اعلیٰ کی دلآزاری انہیں ہر گز گوارا نہیں ہے۔ دھرتی منافقین سے بھلا کہاں پاک ہے۔ آستین میں چھپے دوست نما عدو اٹوٹ وابستگی کا خوبصورت ڈھونگ رچاتے ہیں مگر مکروہ چہروں کی نفسیات سے یہ خوب واقف ہیں اسی لئے دھوکہ کھانے سے وہ محفوظ و مامون ہیں۔

منظور وقار نے میدان طنز و مزاح میں اپنے فن کا سکہ بہت ہی پہلے جما دیا تھا۔ 1990ء میں کرناٹک اردو اکاڈمی کی جزوی مالی اعانت سے جب ان کا نقش اول ''ہنسنا منع ہے'' زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا تو اردو داں حلقہ میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی اور ان کی بے پناہ تخلیقی قوتِ پرواز کا یہی نقطہ آغاز تھا۔ میدان طنز و مزاح کی آبرو بین الاقوامی شہرت یافتہ شخصیت فرزند گلبرگہ مجتبیٰ حسین کے بعد سرزمین گلبرگہ کے مایہ ناز سپوت منظور وقار ہی ایسے واحد فن کار ہیں جنہوں نے اپنے طویل تر تخلیقی سفر کا روشن باب رقم کرتے ہوئے ناقدین ادب کو حیرت کے سمندر میں غرق کر دیا ہے۔

منظور وقار کا چلبلا قلم کبھی ہاتھ پر ہاتھ دھرا خاموش نہیں بیٹھا رہا۔ دوران ملازمت یہ جہاں کہیں بھی رہے اپنے ذوق کی تسکین کے سامان کرتے رہے اور ادبی سفر کو بدستور جاری و ساری رکھا۔ گھنٹوں کے حساب سے تخلیق شدہ ان کے لاتعداد قلمی کمالات بشمول سنجیدہ و تجریدی افسانے' سینکڑوں منی افسانچے' خاکے' رپورتاژ کے علاوہ کالم نگاری کے اچھوتے نمونے اس فن کار کے تخلیقی محاسن اور فنی عظمتوں کو زبان حال سے بیان کرتے ہیں۔ منظور وقار نے ودیعت کردہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے فنی ایمان داری کے دامن کو کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ ان کی طنز و مزاح سے بھرپور تیز و طرار تحریریں معاشرتی برائیوں' بے سر و سامانی اور سسکتی کربناک زندگیوں کی غمازی کرتی ہیں۔ ان کا علامتی کردار جو کبھی علامہ پاگل پاکھنڈی ہوا کرتا ہے اب یہ علامہ کاروباری کا روپ دھارے قاری کو خوب ہنساتا ہے تو خون کے آنسو رلاتا بھی ہے۔ منظور وقار کا یہ آفاقی کردار اپنے آپ میں بے مثال خوبیوں کا خوگر ہے۔ منظور وقار نے اپنے فنی کمالات سے اس کی تخلیق کی ہے۔ یہ علامتی کردار کبھی انگلی تھام کر چلنے کا قائل نہیں بلکہ آزادانہ حرکات و سکنات کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ کبھی وہ مطیع و فرمانبردار بن کر ان کے من کی بات کہتا ہے تو کبھی بزرگ نما دوست اور بعض اوقات وہ مسٹر انڈیا کا روپ دھارے جہاں من چاہا وہاں سیر کرتے ہوئے انکشافات کی جھڑی لگا دیتا ہے۔ یہ غضب کا کردار سفید پوشوں کے گورکھ دھندوں اور ان کی سیاہ کاریوں کو بے نقاب کرنے سے قطعی نہیں گھبراتا۔ اس کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے کمالات سے قاری کو چونکاتا رہتا ہے۔

''دھڑا دھڑ علاج دوا خانے'' میں علامہ کاروباری جعلی سند کی بدولت ماہر طبیب کا لبادہ اوڑھے خوب گل کھلاتا ہے۔ اس کی حق بیانی ملاحظہ کیجئے۔ ''تم تو جانتے ہی ہو وقار! مجھے جھوٹ اور مکر سے کافی نفرت ہے۔ میں ہمیشہ سچ کہنے کا عادی ہوں۔ دواخانہ کھولنے کا اصل مقصد تو دولت کمانا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا مقصد یہ ہے کہ میرے علاج سے زیادہ سے مریض شفا پائیں اور کم سے کم مریض مر سکیں۔''

(اقتباس: پڑھنا منع ہے)

''کاریں'' اس دلچسپ مضمون میں یہ علامتی کردار تن آسان داماد کے بھیس میں نظر آتا ہے۔ جس کا ایک دلچسپ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''ایک دن ہم نے علامہ کاروباری کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ''علامہ سسرال سے ملا ہوا مکان رہن رکھ کر سیکنڈ ہینڈ کار خریدنے کی ایسی کون سی مجبوری تھی؟''۔ علامہ بولے ''وقار! پیدل پھرنے والوں کو دیکھ کر لوگ آنکھیں پھیر لیتے ہیں' موٹر سائیکل سوار کو سلام کرتے ہیں' کارنشین کو دیکھ کر لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر کارنشینوں کو لاکھوں روپے قرض دیتے ہیں بھلے ہی کارنشین قرض لے کر قرض دار کو ٹوپی ہی کیوں نہ پہنائے' علامہ کی باتوں میں ایسا دم تھا کہ ہم دم بخود ہو کر رہ گئے۔ (اقتباس: پڑھنا منع ہے)

سنہ ۶

علامہ کاروباری کل ہندانجمن بے وزن شعرا کے صدر ہیں۔انھوں نے کل ہندانجمن بے وزن شعرا کا کل ہند مشاعرہ کا انعقاد بھی کروایا تھا اس موقع پر علامہ کی تقریر کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''ملک کے مختلف شہروں سے تشریف فرما شعرائے کرام! آج میرا وہ خواب جو میں برسوں سے دیکھ رہا تھا پورا ہونے جا رہا ہے۔اردو ادب کے نقاد علم عروض اور بحر کا خوف ڈال کر بے وزن شاعری کرنے والے شعرا کو واقعی بے وزن اور غیر اہم بنا دیا تھا۔آج کے بعد بے وزن شاعری کرنے والوں کا مقام اور ان کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگے گا۔ویسے بھی شاعری تو شاعری ہوتی ہے اس میں وزن اور ناپ تول کا کیا دخل۔۔۔؟ شاعری کوئی کرانہ شاپ تو نہیں کہ ہر شعر اور غزل کو میزان میں تول کر دیکھ لیا جائے۔''(اقتباس ''ہنسنا منع ہے'')

''وقار۔۔۔۔۔!تمہیں جب صاحب خاکہ کو چنے کے جھاڑ پر چڑھنا نہیں آتا تو خاکے کیا خاک لکھو گے۔ویسے بھی خاکے لکھنا لوہے کے چنے چبانے کے مماثل ہے۔خصوصاً کسی شاعر یا ادیب کا خاکہ لکھنا صاحب خاکہ کے ساتھ کشتی لڑنے کے برابر ہے۔''(اقتباس ''پڑھنا منع ہے'')

''علامہ اپنی پتلی گردن کو فخر سے پھلا کر کہنے لگے بات دراصل یہ ہے وقار ہمیں قرض مانگنے کی عادت ہمارے ملک کے وزیر اعظم کی طرح پڑ گئی ہے۔یہ اور بات ہے کہ ہمارے ملک کے وزیر اعظم ورلڈ بینک سے قرض لیتے ہیں اور ہم دوست واحباب کے سروں پر قرض کی ٹوپی ڈال کر موقع ملتے ہی ان کی لنگوٹی بھی اتار لیتے ہیں۔''(اقتباس ''ہنسنا منع ہے'')

''ہم نے علامہ کی آنکھوں میں اپنی مایوس آنکھیں ڈال کر پوچھا علامہ ہمیں مشاعروں میں غزل سنانے کی اجازت کیوں نہیں ملتی ،ہماری غزلوں میں وہ کون سی خرابی ہوتی ہے جو میر مشاعرہ یا ناظم مشاعرہ کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھتی ہے۔ علامہ تنی ہوئی شیروانی کے بٹن کھولتے ہوئے کہنے لگے میاں وقار۔۔۔۔۔!بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے اور تمہارے کلام میں وہ فرق ہے جس کو زمین وآسمان کا فرق کہا جاتا ہے۔ہمارے کلام میں وزن ہوتا ہے، جب کہ تمہارے کلام میں وزن ندارد۔بحر ایک ایسی ترازو ہے جس میں شاعری کو اردو اخبارات کی ردی کے بنڈلوں کی طرح تولا جاتا ہے۔جب کہ تم بحر سے بے بحر ہو۔(اقتباس ''ہنسنا منع ہے'')

''علامہ کاروباری بولے وقار۔۔۔۔۔۔! مذاق چھوڑو ان دنوں میں کافی سنجیدہ ہوں،کیوں کہ میں نے اپنا نام پی۔ایچ۔ ڈی کے لئے رجسٹرڈ کروایا ہے۔علامہ کے انکشاف پر اس بار حیرت سے اچھل پڑے۔ہمارے منہ سے نکلا علامہ آپ اور اس عمر میں پی۔ایچ۔ ڈی ۔علامہ نے ترکی بہ ترکی جواب داغا۔۔۔۔کیوں میں اس عمر میں بیوی کے سر پر سوتن لاسکتا ہوں تو پی۔ایچ ڈی کیوں نہیں کر سکتا۔''

قلم کے دھنی منظور وقار اپنی تخلیقات کے اولین مسودہ(ڈرافٹ) سے

(بقیہ صفحہ 44 پر)

عالی جناب ڈاکٹر منظر آعجاز معلیٰ القاب ذی شعور شاعر،نقاد،صحافی ناول نگار اور ماہر اقبالیات ہیں۔آپ پٹنہ کے اے این کالج کے شعبۂ اردو کے صدر بھی ہیں۔یہ محض حسن اتفاق تھا کہ اُن کی صاحبزادی فرخندہ اعجاز کی شادی خانہ آبادی میری اہلیہ مہر نگار کے سگے ماموں زاد بھائی جناب سراج الدین صاحب کے نور چشم جمشید میاں کے ساتھ ہوئی اور

نذیر فتح پوری

ایڈیٹر اسباق۔پونے

میں باراتی

رب کے حضور

فریادی ہوں سن لے سائیں

کے طور میں پٹنہ گیا تھا۔ میں نے اس موقع پر سہرا بھی پڑھا

میرا سب کچھ تیرے سبب ہے
بندہ تو میرا رب ہے

میں محتاج ہوں تو قادر ہے
تجھ پر میرا دکھ ظاہر ہے

کتنے زخم ہیں میرے دل میں
میں زندہ ہوں کس مشکل میں

کتنی پیاس ہے کتنا پانی
یہ سچائی کس نے جانی

دردِ نہاں سے تو واقف ہے
اشکِ رواں سے تو واقف ہے

کون ہے محرم میرے غم کا
تجھ سے بڑھ کر کون مسیحا

دھوپ میں سایا دینے والے
آنکھ کو سپنا دینے والے

پھول کو خوشبو دینے والے
رات کو جگنو دینے والے

لفظوں کو ادراک عطا کر
لہجہ اک بے باک عطا کر

جذبوں کو تاثیر دے مولیٰ
خوابوں کو تعبیر دے مولیٰ

فریادی ہوں سن لے سائیں

☆☆☆ دوسرے دن ۲۳ر دسمبر ۲۰۱۴ء کو

گوپال گنج (بہار) کے جواں فکر شاعر
غلام سرور ہاشمی کا اولین شعری مجموعہ

افکارِ سرور

جلد ہی منظرِ عام پر آرہا ہے
رابطہ: بسڈ یلا ٹولہ۔مرغیان بسڈ یلا۔گوپال گنج۔855113(بہار)

فیاض احمد ڈار

ریسرچ اسکالر۔دیوی اہلیہ وشوودیالیہ یونیورسٹی۔اندور(ایم۔ی)

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کی موجودہ صورت حال

منظر اعجاز صاحب نے اپنا شعری مجموعہ ُورق ورق اُجالا ٗ مجھے تحفتاً اظہار خیال کے لئے پیش کیا۔اس کتاب کو بہار اردو اکادمی کے تعاون سے ۲۰۰۹ء میں شائع کیا گیا ہے۔چونکہ یہ کتاب مجھے للکارتی رہی ٗ میں اُسے آہستہ آہستہ لغت کی مدد سے پڑھتا رہا۔ایک سال بعد جب مجھ میں کچھ خود اعتمادی آئی تو اپنا خیال ظاہر کرنے کی مودّبانہ گستاخی کر بیٹھا ہوں۔خیر۔

اُن کی معجز بیانی سر آنکھوں پر لیکن اُن کی معرکتہ الآرا کتاب خوش بیانی کے گرداب میں اُلجھ کر رہ گئی ہے۔اُن کے خیال کا پیچیدہ پن،لفظیات کی ستم ظریفی، طنز آمیز صورتِ حال،ذہنی اُلجھاؤ ٗ اظہار کا ترچھا پن اُن کی شاعری کی پیچیدگی کا معنی خیز اظہار ہے۔اس کو پڑھ کر مجھ جیسے غریب قاری کا حال خلا میں معلّق تری شنکو جیسا ہوجاتا ہے اور اُسے یہ ماننا پڑتا ہے کہ غزل کی لطافت نکتہ پردازی میں ہے۔اس سے سخن میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

کسی قدر آج بھی منظر ہے قیامت انگیز۔ترا اندازِ تبسم،مرے آداب کا رنگ

یہ شعر رومانی ہو کر بھی غیر رومانی ہے۔اب یہ بھی شعر دیکھیں:۔

جب کسمسائی سانسوں میں خوشبو حیات کی۔رکھ کر زبان کانٹوں پہ پھولوں سے بات کی

اس شعر کا ثانی مصرع بعید از قیاس لگتا ہے۔باہر سے بات بھلے ہی بے تکی لگتی ہو اندر سے سچائی ظاہر کرتی ہے۔اصلی شاعری تو PARADOXICAL ہے جو بظاہر مہمل مگر در حقیقت صحیح بات ہے۔اس میں سقراطی طنز ہے ٗ جو زندگی کی ستم ظریفی کو تجاہلِ عارفانہ کے طور پر ظاہر کرتا ہے۔یہی منظر آعجاز کی شاعری کا جوہر لطیف ہے۔اُن کی فصاحت اور بلاغت کے مدِّ نظر اُنھیں پُر شکوہ الفاظ کا بادشاہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے۔اگر وہ بنیادی حقیقت میں خدا کا رنگ دیکھ لیتے تو اُن کا قنوطی رنگ پُر اُمید رجائیت پسند ہوجاتا مگر بیم ورجا سے پرے دیکھنے والا دیدہ ور بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔مزید برآں ان کی چند غزلوں کو عروض کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا تو وزن صحیح نکلا۔نمونے کے طور پر مندرجہ

ذیل اشعار کو دیکھیں،جن کا وزن فاعلاتن فاعلاتن،فاعلن ہے:۔

تھا پسِ آئینہ جب تک زنگ تھا۔ پیشِ آئینہ ہوا تو رنگ تھا
آج بھی سرچشمۂ تخلیق ہے۔کل بھی وہ تکوین کا فرہنگ تھا
ساز کا ہر تار تھا منظر خموش۔چھیڑتے ہی اک ذرا آہنگ تھا

جناب وہاب اشرفی صاحب نے منظر آعجاز کو فکری کشاکش کا شاعر نامزد کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ موصوف Contradiction,Irony ,Satire کے شاعر ہیں۔بلکہ اُن کا کلام paradox کے جوہر سے بھرپور ہے۔جناب ظفر ندیم نے بھی کہا ہے کہ ڈاکٹر منظر اعجاز کی شاعری Complexity پر زندہ ہے۔

ہر کسی ماہر فن کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی رائے دے لیکن میں کسی شاعر کو دوسروں کی نگاہ سے نہیں اپنی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔عرض یہ ہے کہ ایک عام قاری میرؔ،غالبؔ اور اقبالؔ کو پڑھ کر لطف اندوز ہوسکتا ہے لیکن منظر آعجاز اُن سے بھی کہیں زیادہ سنجیدہ نظر آتے ہیں۔یہ ان کے فکر اور ادراک کا کمال ہے۔قاری کی مشکل آسان تو ہوگی مگر مشکل سے۔اُن کی فکر انگیز غزلوں سے اُن کی شناخت ہوتی ہے۔اس طرح ان کی صلاحیت اور ذہنی توانائی کا پتہ چلتا ہے۔اگر اُن کی غزلوں کے سیپ میں موتی مل جائے تو پھر لطف ہی لطف ہے لیکن یہ کام کچھ طرح دے گیا ہے۔

بہر حال منظر آعجاز کی شاعری عجیب تناقض اور غیر معمولی تضاد کا آئینہ ہے۔جس پر مزاج اور ماحول کے تصادم سے بال آگیا ہے۔ان کی ذہنی فکر تناؤ پیدا کرتی ہے۔اگر وہ ُہاں ٗ اور ُنہ ٗ کی کشاکش کو رد کر دیتے ہیں تو ایک مختلف قسم کی شاعری وجود میں آسکتی ہے لیکن یہ ناممکن ہے کیوں کہ وہ اثبات اور نفی میں حامی دیکھنے کے عادی ہیں اور چونکہ یہ اُن کا نصب العین ہے وہ اسے بڑے سلیقے سے نبھاتے ہیں۔

الغرض ان کی شاعری میں جو شستگی ٗ سپردگی پائی جاتی ہے شاید نقّادوں کو پسند نہ آئے۔اُن کے مجموعہ کلام ’’ورق ورق اُجالا میں‘‘ پُرگو ہمہ جہت اُن کی شاعری تو ہے ہی اُس کے علاوہ چھوٹی،تازہ،شگفتہ،بحروں میں کمال کے اشعار بھی ملتے ہیں۔لوچ ٗ ترنم کے پُر تاثیر اشعار میں سے کچھ ملاحظہ فرمائیں

یہ وہ جگہ ہے جہاں لیتی ہیں امید پناہ۔نہ جانے کیسی کشش اب بھی دشت یاس میں ہے
یہ وہ جگہ ہے جہاں سمتیت بھٹکتی ہے۔کوئی تو ہو جو مجھے چھوڑ دے مرے گھر تک

اور یہ شعر بھی دیکھیں کہ لفظوں کی اُٹھان کس طرح خیالوں کا زینہ بناتی ہے۔

چہرہ بھی ٗ آئینہ بھی اور پردہ دار جلوہ بھی۔پیشِ منظر بھی تو ہی ٗ تو ہی پس منظر بھی ہے

ان کی شاعری حرفی اور لفظی تکرار میں خوب سنورتی ہے۔دیکھیں ایک ہی لفظ کا دہراؤ ایک خاص اثر پیدا کرتا ہے:ورق ورق،رنگ رنگ ٗ خواب خواب ٗ شکن شکن ٗ لہو لہو ٗ مبہم مبہم ٗ قدم قدم ٗ پلک پلک ٗ نظر نظر ٗ ریزہ ریزہ ٗ حرف حرف وغیرہ۔

اسی طرح صفحہ 47 پر دی گئی غزل نمبر 13 تشبیہات کی عالی شان مثال

غزلیہ مجموعہ ''حرفِ جاوداں'' اور نعتیہ مجموعہ ''نورِ حرا'' کے خالق سید نفیس دسنوی ادب کے عصری منظر نامہ میں ایک ایسی جانی مانی شخصیت ہیں جنھیں ادبی حلقوں اور مشاعروں میں یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ان کی نعتیہ شاعری جہاں عشقِ رسول کی سرشارانہ کیفیت سے شرابور ہے وہیں غزلیہ شاعری انھیں ایک صالح فکر اور تعمیر پسند شخصیت کے بطور روشناس کراتی ہے۔خصوصاً غزلوں میں فکرِ اسلامی کے نقوش بالکل واضح نظر آتے ہیں۔خوشی کی بات ہے کہ اب وہ اپنا تیسرا مجموعۂ کلام

لفظ لفظ آئینہ

لے کر ہمارے سامنے جلد ہی آ رہے ہیں۔اس تیسرے پڑاؤ تک آتے آتے ان کی شاعری ژرف نگاہی، دروں بینی اور صلابتِ فکری کا روشن ثبوت پیش کرنے لگی ہے۔ان کی شاعری کے تعلق سے مشاہیرِ ادب فرماتے ہیں:۔

☆ **پروفیسر کرامت علی کرامتؔ (کٹک)**:۔راقم الحروف کو اس امر کے اعتراف میں کوئی عار نہیں کہ نفیس دسنوی نے ''حرفِ جاوداں'' کے دور سے نکل کر ''لفظ لفظ آئینہ'' کے دور تک پہنچتے پہنچتے تغزل آمیز رومانیت سے لے کر سارے عالم کے بنتے بگڑتے سیاسی، اخلاقی، روحانی اور نفسیاتی ماحول کے واقعیت پسندانہ اظہار تک ایک لمبی مسافت طے کی ہے۔

☆ **علیم صبا نویدی (چنئی)**:۔''جناب نفیس دسنوی اپنے نام کے مطابق اپنے کلام میں بھی پوری نفاست سے کام لیتے ہیں اور ظاہر ہے اچھی شاعری کے لیے اچھے شاعر کا ہونا لازم و ملزوم ہے جس کا بین ثبوت اس شعر میں نمایاں اور روشن ہے:

رکھو تم شوق سے رشتہ جنونِ فرقہ بندی کا
ہمارا سلسلہ لیکن رواداری سے ملتا ہے

☆ **ڈاکٹر مختار شمیم (بھوپال)**:۔نفیس دسنوی کی شاعری ہمارے عہد کی آواز ہے۔اردو شاعری کی دنیا میں یہ آواز دور تک سنائی دے گی۔یقیناً نفیس دسنوی کے تازہ مجموعہ ''لفظ لفظ آئینہ'' کی اہلِ نظر پذیرائی فرمائیں گے اور ان کی تخلیقی نمو کی داد دیں گے۔

☆ **سعید رحمانی (کٹک)**:۔نفیس دسنوی کی شاعری کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ موصوف ملنسار اور خلیق ہونے کے ساتھ ساتھ دل میں ملی درد بھی رکھتے ہیں۔شاعری کو تفننِ طبع کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ اصلاحِ نفس، تعمیرِ انسانیت، اخلاقیات اور اسلامی روایات کے فروغ کا مؤثر وسیلہ گردانتے ہیں۔شاعری کے تعلق سے ان کا مطمحِ نظر ہے:۔

جو پیامِ بیداری دے نفیسؔ دنیا کو
آج کل ہمیں ایسی شاعری ضروری ہے

انتظار کریں:

جلد ہی منظرِ عام پر آرہا ہے

رابطہ:۔ Syed Nafees Desnavi.D-205, Sector-6. C.D.A. Colony, Cuttack-753014(Odisha)
Mob-9437067585

غزلیات

ہے ۔یہ دو اشعار بھی دیکھیں:۔ یہ لہو ہے ہوجو طرح نفس مہک بھینی نظر شبِ ہو

ڈاکٹر محبوب راہیؔ
BarsiTakli.Akola-444401 (M.S)

ہم تھے چاہت کے چھلکتے جام تھے یادش بخیر
کس قدر دلکش وہ صبح و شام تھے یادش بخیر
تھا غم و آلام سے ہر شخص نالاں ہم مگر
بے نیازِ کلفت و آلام تھے یادش بخیر
جلوہ گر تھیں اپسرائیں حور و پریاں جابجا
اور ہم شہزادۂ گلفام تھے یادش بخیر
آج چرچے ہیں ہماری پارسائی کے جہاں
کل انھیں گلیوں میں ہم بدنام تھے یادش بخیر
نام اپنا بھی کسی کے چاہنے والوں میں تھا
ہم کسی کے بندۂ بے دام تھے یادش بخیر
ان دنوں سودائیوں میں تھا ہمارا بھی شمار
سر ہمارے بھی کئی الزام تھے یادش بخیر
جن کے نقشِ پا ہوئے منزل نشاں راہیؔ مجھے
میرؔ و غالبؔ حافظؔ و خیامؔ تھے یادش بخیر

رنگ دل،دلِ نور،راز تمناؤں کا شیرازہ جھلملاتا پلکوں پہ ستاروں کی نفس میں بھینی خوشبو نظر میں انتظار جیسے

اخترؔ شاہجہانپوری
Rangeen Chaupal
Shahjahanpur-242001(U.P)

سارا منظر صاف دکھائی دیتا ہے
قاتل دلبر صاف دکھائی دیتا ہے
سکھ کا ساحل میری نظروں سے اوجھل
دکھ کا سمندر صاف دکھائی دیتا ہے
قلبِ صحرا میں تم غور سے دیکھو
میرا ہی گھر صاف دکھائی دیتا ہے
خون کا دعویٰ کس پر ہوگا سوچتا ہوں
اس کا خنجر صاف دکھائی دیتا ہے
خوش قسمت ہوں بالا قدوں کی محفل میں
میرا پیکر صاف دکھائی دیتا ہے
ہار نہ ہمت اور بڑھا دو چار قدم
میل کا پتھر صاف دکھائی دیتا ہے
روز و شب کے ان ہنگاموں میں اخترؔ
رنگِ محشر صاف دکھائی دیتا ہے

ڈاکٹر قمر الزماں (بانکورا مغربی بنگال)
Mob-07076557266

ہو ثمر دار جھکتی ڈالی ہے
کون ہے جو نہیں سوالی ہے؟
کاش تم بھی اسے سمجھ لیتے
دونوں ہاتھوں سے بجتی تالی ہے
سینہ تانے سڑک پہ جاتے ہو
خوب جلوہ جنابِ عالی ہے
کیا حسیں امتزاج ہے رنگ کا
چہرہ گورا ہے زلف کالی ہے
اگتے سورج کی جیسے کرنیں ہوں
جو لبوں پہ تمہارے لالی ہے
کہتے رہتے ہو مجھ کو بے غیرت
کیا مزے کی تمہاری گالی ہے
میرؔ صاحب کی بات کیا کہیے
ان کی ہر بات ہی نرالی ہے
ذوقؔ پر جو نثار ہے آزادؔ
یادِ غالبؔ میں غرق حالیؔ ہے
سیر کرنا زماں ہو گرمی میں
یا تو گلو ہے یا منالی ہے

شب گیرِ روح محفوظ،سوز غیور،نگاہ طور،طرزِ تغافل،منظر شعور، پابند نگاہ،میزانِ نظر،روحِ انا، سکونِ دل،غمِ حیات،بساطِ شوق، مشامِ جاں، گردشِ وقت، بارشِ سنگ،صوتِ اذاں،سنگِ نشاں،خشتِ مکاں، دشتِ قصری جہاں، زباں،حرفِ اعتبار،فصیلِ دار جلوہ وغیرہ۔تلمیحات کا دیکھیں:۔ خضر بھی،موسیٰ بھی میں،رہ گزرِ شوق بھی

محفوظ اثر
C/O:Islamia High School &
JuniorCollege.Mominpura
Nagpur.Mob-9325581977

مزید براں

پلکوں پر جو آنسو تھے
تیرہ شبی میں جگنو تھے
کوئی کیسے قید میں رکھتا
ہم تو گل کی خوشبو تھے
کس نے چرائی مورت پھر
مندر میں تو سادھو تھے
دولت اپنے پاس تھی جب
لوگ بھی آزو بازو تھے
شہر میں اس کی شہرت تھی
پاؤں میں جب تک گھنگرو تھے

ترکیب سے استعارے تیار کئے تصویر بنانے میں ہیں:۔حرفِ ادبی،فکرِ انسان،زخم فکر،چشمِ خودشناس، عبارت،رنگ نظر، جیت میں ان کی پوشیدہ برگِ گل، ربابِ دل، جذبۂ ہار کے بھی کچھ پہلو تھے شوق، لمحۂ اضافت کی فارسی خوبصورت جو لفظی معاون لاخالق تمنا،حریم نقشِ جمیل،

ڈاکٹر اعجاز داؤدنگری
Daudnagar.Aurangabad
Bihar)Mob-9546926786

بہت زود گوئی تھی فنکار ہوتا
وہ لہجے کا جادو قلمکار ہوتا
سفر کی اذیت بتاتے کسے ہم
خدا بس ہمارا مددگار ہوتا
بہت خم خوردہ تھا دیوانہ کوئی
ان آنکھوں سے کیسے اب اظہار ہوتا
کہاں دل لبھاتی کبھی گھر کی رونق
کہاں ہم یہ غالب یہ بازار ہوتا
مقدر میں لکھی اگر تیرگی تھی
کہاں روشنی کا وہ مینار ہوتا
یہ اعجازؔ ہوتا نہ کم زندگی کا
اجالے کا میں بھی طلبگار ہوتا

مومن خاں شوق
AshrafVilla,11-3-723
Mallepally.Hyderabad-5

عشق میں دل مرا کیا سے کیا بن گیا
یوں تمنا کا پھر سلسلہ بن گیا
کام آہی گیا نسبتوں کا بھرم
اجنبی شخص بھی آشنا بن گیا
زندگی پیچ و خم سے گزرتی رہی
لوگ چلتے رہے راستہ بن گیا
زہر غم دشمنوں نے دیا تھا مگر
یہ خدا کا کرم ہے دوا بن گیا
صحنِ گلشن میں جب اس نے انگڑائی لی
شوقؔ منظر بڑا خوشنما بن گیا

میں ۔خود مسافر بھی ہوں میں ہوں نغمۂ حدیث سہی اُسے پاروں کی امن کا سوزِ بلالی

اور خود ہی نمائندہ روح دلِ بیتاب ۔پڑھ نہ پھر بھی قرآن کے طرح امکان نہیں کے بغیر۔کعبۂ

جمیل فاطمی
At/P.O:Lkhminia.Dt:Begusarai
Bihar-851211
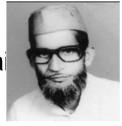
بے سکونی ہے بے قراری ہے عشق
میں ہو آج پھر رات ہم پہ بھاری ہے صوتِ
اذاں نیند روٹھی ہوئی ہے آنکھوں سے کی تعبیر
حق و جو بھی لمحہ ہے اضطراری ہے باطل کی
جب سے بچھڑے ہیں اپنی مٹی سے
ہم نے رورو کے شب گزاری ہے
ہم سے چھوٹا ہے جادۂ حق بھی
دل کی بازی بھی ہم نے ہاری ہے
خاک زادہ ہے، کچھ تو بہکے گا
بندہ نوری ہے اور نہ ناری ہے
اپنی فیاضیاں جتاتے ہو
دوست! کیسی یہ غم گساری ہے
آگ بھڑکی ہے پھر تعصب کی
قریہ قریہ پہ خوف طاری ہے
بند رکھیے جمیلؔ ہونٹوں کو
لب کشائی میں صرف خواری ہے

ڈاکٹر مسعود جعفری
Shaikhprt.Hyderabad
Mob-9949574641

اسی لئے تو چمک ہے بہت اندھیرے میں
کوئی تو چاند ہے پونم کا اس بسیرے میں
ہماری جان اٹک سی گئی ہے ہیرے میں
چرا سکو تو چرا لو اسے اندھیرے میں
مسافروں سے کہو اور نہ چلیں رستہ
چلو کہ رات گزاریں گے اس کے ڈیرے میں
ہمارے پاؤں ہیں آزادیوں کے جادے پر
ہماری روح کی سرمستیاں پھریرے میں
چلو بچائیں اجالوں کو کچھ کریں یارو
اندھیرے لے نہ سکیں نور کو بھی گھیرے میں
ابھی تو دشت کا منظر ذرا بدلنے دے
بہے گا پیاس کا دریا بھی اور ڈیرے میں
بلکتا رہ گیا آخر ہجوم میں میں بھی
رفاقتیں بھی کہاں رہ گئیں ہیں میرے

گوہر شیخ پوروی
Saiban.DoliGhat.PatnaCity-8
Mob-9386999359

نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ منظر اعجاز نقاد ہوتے
ہوئے بھی سخنوری کے تمام لوازمات و واجبات
کے کوچۂ غیر سہی، گوشۂ زنداں ہی سہی ساتھ
شاعری کو میری آنکھوں میں بس اب خوابِ پریشاں ہی سہی معراج
تک سہی پہنچانے
میں سانس کے ساتھ بہر حال ہے زندہ رہنا کامیاب
ہوئے اپنی مرضی نہ سہی، مرضیِ یزداں ہی سہی ہیں۔
جب مسلسل مجھے رہنا ہے سفر میں تو پھر ماسوا وہ اپنا
مخصوص راہ میں گل نہ سہی، خارِ مغیلاں ہی سہی رنگ لے
کر جلوہ جو بھی دینا ہے مرے ظرف کی حد تک
دیدے
صبحِ عشرت نہ سہی، شامِ غریباں ہی سہی
کچھ خطا میری ہو تو اس سے معافی مانگوں
بے سبب مجھ سے وہ نالاں ہے تو نالاں ہی سہی
میرے اشکوں کا مقدر ہے فروزاں ہونا
اپنی مژگاں نہ سہی، آپ کا داماں ہی سہی

سید آصف دسنوی
C-12,Sector-6.C.D.AColony
Bidanasi-14(Cuttack)

کشاکش سے ملی کس کو
نجات۔ بدلے
'نہ آزر بدلے منظر نہ براہیم
چہرے بھی سرکاری ہیں
یقیناً منظر سب خاک کے درباری ہیں اعجاز کی
شاعری اُن کیا سیکھا کیا جانا ہے کے عقل و
خرد کی عکاس سب باتیں سنساری ہیں
ہے۔ جس جاگ رہی ہے جیسے بھور
حیات و کیا آنکھیں کجراری ہیں ممات کی
تجلیات جلوہ جن پر سب کچھ ہار دیا افروز ہوتی
ہے۔ یہ ایک دو آنکھیں متواری ہیں ایسی
خداداد کیا سوچو ہو آصفؔ جی صلاحیت
ہے جو ہر کسی چہرے سب عیاری ہیں کو نصیب

صابر فخرالدین
Opp:PoliceQuarters.MainRoad
Yadgir-585202(Karnataka)

ساتھ میرے کیا نہیں تھا
میں کبھی تنہا نہیں تھا
آئینہ صورت رہا میں
آئینہ دیکھا نہیں تھا
ہیں۔ جیسے کہ "جہاں خود ہی ملنے آ گیا وہ
رنگ رنگ میں نے خط لکھا نہیں تھا
منظر تک"، "مرجھایا ہوا لوگ جیسا کہہ رہے ہیں
ہوا تصویر کا میں مگر ویسا نہیں تھا
رنگ ہر صبح کا منظر جیسے بوجھ سر سے زندگی کا
"،"فسوں رنگ تجلی عمر بھر اترا نہیں تھا
دے"، "یقین کا رنگ بات کچھ ایسی تھی صابرؔ
غبار بھی ہے"، "میری اس لیے کہتا نہیں تھا

حیرت فرخ آبادی
KhoslaHouse.NorthOfficePara
Doranda.Ranchi-834002

آستینوں میں مرے یاروں کی خنجر نکلے
"جن کو انسان سمجھتے تھے وہ پتھر نکلے"
آبلے پڑ گیے ہونے لگی آنکھوں میں جلن
اشک میرے جو مری آہ سے جل کر نکلے
گر ہوئے
پھول برسائے مرے یاروں نے تو چوٹ بھی پہنچی نظر
لگی
ہونٹوں کا تبسم اڑا پھول لپٹے ہوئے دراصل وہ پتھر نکلے
رنگ"، "رنگ میں صدف ڈھونڈتا پھرتا ہوں دلوں میں
یارو
خواب دوانے کا کاش اک روز کسی میں سے تو گوہر نکلے
خواب زار نہ اتنی طاقت سے مرے یارو گلا گھونٹو مرا
بھی ہے وہم کا چیخ سینے ہی میں گھٹ جائے نہ باہر نکلے
تعبیر کا آئینہ

اظہر نیّر
Vill,&P.O.Blarhulla.Via:KansiSimri
Barhulia,Dist,Darbhanga(Bihar)
Mob-9939749452

میں تو ظاہر ہی نہیں کرتا حقیقت اپنی
لوگ رکھتے ہیں رکھیں مجھ سے عداوت اپنی
جو بھی ہاتھوں کی لکیروں میں لکھا ہے ہوگا
بھول سکتی نہیں تقدیر تو فطرت اپنی
لٹ گیا گھر میں ہی سامانِ حیاتِ دوراں
سوچتا ہوں میں کروں شہر سے ہجرت اپنی
گونگے بہرے ہوئے حکام بھی شہرِ غم میں
اب بھلا کس سے کروں گا میں شکایت اپنی
اپنے سجدوں پہ کبھی شیخ نہیں اترانا
گر تکبر ہو تو بیکار عبادت اپنی

صابر ادیبؔ
35,Gulkada.)pp0:KachhiMasjid
Shahjahanabad.Bhopal-462001

ہر اک لہجہ میں ہے دکھ درد پنہاں تم نہ سمجھوگے
ہمارا عہد کیوں ہے خوں بداماں تم نہ سمجھوگے
محبت، دوستی، اخلاص، چاہت، انس، غمخواری
یہ سب انسانی قدریں کیوں ہیں بے جاں تم نہ سمجھوگے
نہ سمجھیں ہیں نہ سمجھیں گے فلک کو یہ زمیں والے
سمجھ لیں گے تو ہوگی عقل حیراں تم نہ سمجھوگے
دعا دی تھی کبھی تم نے مجھے آباد رہنے کی
میں ہوں آباد کیسا یہ مری جاں تم نہ سمجھوگے
خطائیں معاف کردینا خطا کاروں کی تن من سے
مرا مسلک، مرا ہے دین و ایماں تم نہ سمجھوگے
ہمارے ارتقا کی نذر کتنی ہوگئیں قدریں
یہ بچے باپ سے ہیں کیوں گریزاں تم نہ سمجھوگے
اِدھر غارت گری ہے تو اُدھر ہے قتل وخوں صابرؔ
ہوا ہے کس قدر حیوان انساں تم نہ سمجھوگے

احمد امام بالاپوری
ChudiMahal.Balapur.444392
Dist:Akola(M.S)

مجموعۂ
کلام''ورق ورق اُجالا''ایک طویل
استعارہ ہے، جس پر غور و خوض کریں تو اُن کا
فلسفۂ حیات کیا کچھ نہیں کیا گیا پھر بھی نہیں رکی اُبھر کر
سامنے پھونکے بغیر آشیاں بجلی نہیں رکی آجائے گا
جو ایک دوچار ہی چراغ جلے اور یوں ہوا صوفیانہ طرز
حیات کی جب تک نہ تیرگی ہوئی آندھی نہیں رکی طرف
اشارہ کرتا اغلب یہی ہے ساحلِ بحرِ حیات پر ہے۔
عیش و نشاط کی کبھی کشتی نہیں رکی آگے یہ بھی
کہتا چلوں گو بندھ باندھتا رہا خستہ روانِ دل کہ منظرؔ
اعجاز کی منہ زور رنج وغم کی یہ ندّی نہیں رکی شاعری کے
بارے میں پگڑی کسی کے سر سے گرانے کے زعم یہ عام رائے
بن پائی ہے میں کہ جناب
نہایت ذی سر پر جنابِ عالی کے پگڑی نہیں رکی فہم شاعر
ہیں لیکن اُن ایسا تھا زورِ بارشِ آلامِ روزگار کی شاعری

مظہر محی الدین
C/O: IsmailPanwala.3rd Cross
H.No:9-7-680.NearMhanthaliyaSchool
B.T.PatilNagar.Koppal-583231(Karnataka)
Mob-9448326670

مرے خواب کا رنگ،''حسن عروسِ فکر،دلِ
دیدہ تر کا رنگ،''رنگ خوشبو،گلاب
کی
منفرد تاک میں ہر ہر قدم ہے جم ہمیں معلوم ہے
کس میں کتنا بل اور کتنا دم ہمیں معلوم ہے
غزل اتحادِ باہمی مطلب پرستانہ تیرا
پھوٹ کا سرچشمہ ہے سنگم ہمیں معلوم ہے
کس سے پوشیدہ تیرا مکر و فریب
تھا آشکارا ہے سدا سرگم ہمیں معلوم ہے
پھر صدائے حق کی ہر جانب ہے گونج
وغیرہ پھر مداری ہوگیا برہم ہمیں معلوم ہے
حکمرانی، خوش نمائی، اس میں بس
خم ہی خم ہے خم ہمیں معلوم ہے
رنگ آسماں جس کا نگہہ باں ہر گھڑی
ہے۔ حق میں کتنا زور کتنا دم ہمیں معلوم ہے
کارِ بد کا آخر ش انجامِ بد مظہرؔ اٹل
میں آنکھ مظلوموں کی ہے پُرنم ہمیں معلوم ہے

محمد امجد سلیم امجدؔ (کریم نگر)
Mob-9550664623

صرف
شعور و علم سے وابستہ آگہی اپنی
قابل فہم
سوگندھ، سبھوں کو بھاتی ہے محفل میں شاعری اپنی
قاری
رنگ، یہ حضور سیکھیے ہم سے قرینہ الفت کا کے لئے
آہنگ دلوں کو جوڑتی ہے ربطِ باہمی اپنی قابل فہم
کا لے ضیا ملے گی تمہیں ملگجی اندھیروں میں ثقیل
جا،''جو بھی چراغِ مہر و محبت ہے رہبری اپنی
اک عالمِ خزاں کا دور ہو یا بہار کا موسم اُتار نہیں
نیرنگ تھا ہری بھری سی رہے کشتِ زندگی اپنی کے لئے
سے ہمارے طور کی ہر اک ادا بصیرت ہے عشق
منظرؔ اعجاز کا دل و نگاہ میں دلکش ہے رہروی اپنی رسائی
مخصوص ہنر ہے کوزے میں دریا کو بند کرنے لئے
کا حصار
عیاں ہوتا کمال رکھتی ہے بے شک سخنوری و راز کی
اپنی
میری نظر نشاط وعیش میں ہے ان کی زندگی لیکن کو قبول
ان کا پورا بصد گراں بھی نہیں ہم پہ مفلسی اپنی

تجمل شفائی
Kagzipura.Post:Erandol
Dt: Jalgaon-425109(M.S)

شرپسند سمجھے تھے جس کو وہ بشر ایسا نہ تھا ہے۔وہ غیر مانوس
امن کا پیکر تھا لیکن فتنہ گر ایسا نہ تھا لفظیات کا لبادہ
کل یکا یک بادلوں سے قہر برسا برف کا سکتے۔عام قاری
آج بھی برسا ہے لیکن وہ قہر ایسا نہ تھا مسئلہ یہ ہے کہ
کچھ تو کرتا تبصرہ وہ بھی سیاسی جنگ پر حقیقی تک اُس کی
کیا تری محفل میں کوئی دیدہ ور ایسا نہ تھا مشکل ہے۔ اس
جانے کیا کیا کہہ رہا ہے آج دیوانہ ترا عشق مجازی کے
اس سے پہلے بھی تھا دیوانہ مگر ایسا نہ تھا میں رہ کر اُسے رمز
آگ میں جلتا ہوا اور خون میں لپٹا ہوا باتیں سمجھائی
اس سے پہلے امن کا اپنا نگر ایسا نہ تھا جائیں۔اس بات
ہم امیروں کے محلے میں تجملؔ آگیے کرتے ہوئے وہ
یہ مکاں سب کانچ کے ہیں اپنا گھر ایسا نہ تھا

کہتے بھی ہیں کہ ؎

رحمت علی رحمت
MohallaWaliGanj.P.O:Ara
Dist:Bhojpur-802301(Bihar)

منظریہ والے اسلوب

غریبِ شہر کو ہے کس مکان سے رشتہ
سلگتی ریت کا کب سائبان سے رشتہ
کسی زمیں نہ کوئی آسمان سے رشتہ
تخیلات کا لیکن اڑان سے رشتہ
ہوائے تند میں جلتا ہے زندگی کا چراغ
ہے لمحہ لمحہ مرا امتحان سے رشتہ
میں دورِ نو میں ستاروں کی سیر کرتا ہوں
زمیں پہ رہ کے رکھوں آسمان سے رشتہ
جنھیں رہا نہ تعلق کبھی مرے گھر سے
غرض پہ جوڑتے ہیں خاندان سے رشتہ
بنا لیا تھا شریکِ حیات میں نے جسے
اسی نے کاٹ دیا درمیان سے رشتہ

ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی
Malangua.Sarlahi.Nepal
Mob-8229055737

غزل شوقِ جنوں جو رکھتا ہے دل میں پال کے
لاتا وہی ہے موج سے کشتی نکال کے
غزل ہو نوکری یا اور کسی محکمے کام
ہوتا کہاں بغیر ہے رشوت، دلال کے
ایسی حکومتیں کہاں ہوتی ہیں پائدار
بنتی ہیں جور و جبر کی بنیاد ڈال کے
یہ عشق بھی ہے چیز کیا لگ جائے جس کے ساتھ
جھکتا نہیں ہے روبرو جاہ و جلال کے
کس جرم کس گناہ کی آخر ہے یہ سزا
"بوڑھا اکیلا رہ گیا بچوں کو پال کے"
رب کی امان میں وصی رہتا ہے اس کا مال
رکھتا ہے جو زکوٰۃ کا حصہ نکال کے

افسر عثمانی
H.No:5-38,T.R.NagarColony
POst:

تعریف اپنی آپ سنانے لگے ہیں لوگ
اوچھی حماقتوں کے دوانے لگے ہیں لوگ
صدق و صفا کی بو نہیں اعمال میں ذرا
حلیہ گری کو دین بتانے لگے ہیں لوگ
سنت کی پیروی سے بہت دور جا پڑے
مسلک کے راگ سننے سنانے لگے ہیں لوگ
اکلِ حلال کی ہے کسے فکر دوستو
مالِ حرام کھانے کھلانے لگے ہیں لوگ
تہذیبِ نو نے ان کو یہ فیشن عطا کیا
کہنے کو مرد ہیں پہ زنانے لگے ہیں لوگ
افسر رقابتوں نے اکھاڑی ہوائے قوم
ملت تھی ایک، فرقے بنانے لگے ہیں لوگ

کھنک۔چند سانسوں کے تقاضے ابھی زندہ ہوں کاش وہ صفحہ 37 غزل کا لب ولہجہ اختیار کر سکتے جس بھارت کی مٹی کی مہک آتی ہے۔

نادر اسلوبی
6-5-6,Hanamkonda
Warangal-506011(T.S)

سمجھیں تم دیکھو ساز میں سوز

دولت کو دورِ نو میں بڑا مان مل گیا
انسان کی تلاش تھی شیطان مل گیا
دیکھا کبھی کسی کو جو بڑھتے مری طرف
تو دوستوں نے کہہ دیا نادان مل گیا
ہم احتراماً اس کی سلامی کو جاتے پر
شرمندہ کرنے ہم کو وہ خود آن مل گیا
کتنی بڑی خوشی ملی اے دوست کچھ نہ پوچھ
جب مجھ کو اپنے پیار کا امکان مل گیا
منوا لیا بشر سے بھی حیوان نے وفا
یوں طنز تو نہ کیجئے حیوان مل گیا
افسانۂ حیات کا حاصل فریب ہے

بی۔ایس۔جین جوہر
B-7,IndustrialEstate.Partapur
DelhiRoad.Meerut-250103(U.P)
Mob-9358400900

حرفِ علامت میں جذبوں کا اثر ہے آواز میں باقی ہے

جانے پھر تم سے ملاقات کبھی ہو کہ نہ ہو
کھل کے دکھ درد کی کچھ بات کبھی ہو کہ نہ ہو
پھر ہجومِ غمِ جذبات کبھی ہو کہ نہ ہو
تم سے کہنے کو کوئی بات کبھی ہو کہ نہ ہو
آج تو ایک ہی کشتی میں ہیں منجدھار میں ہم
پھر یہ مجبوریِ حالات کبھی ہو کہ نہ ہو
عہدِ ماضی کے فسانے ہی سنا لیں تم کو
اتنی خاموش کوئی رات کبھی ہو کہ نہ ہو
جو جلاتا ہے مرے غم کے اندھیروں میں چراغ
میرے ہاتھوں میں وہی ہات کبھی ہو کہ نہ ہو
"آ گلے مل کے کریں دور گلے شکوے سب
آخری وقت ملاقات کبھی ہو کہ نہ ہو"

عبدالمجید فیضی سمبلپوری
12/106,Nayapara.Sambalpur-1
Mob-9778291038

رنگ دنیا کا جو تھا کل آج بھی وہ ہے سو ہے
زندگی کی تھی جو ہل چل آج بھی وہ ہے سو ہے
دردِ فرقت بھی وہی ہے، رنجِ غربت بھی وہی
آنسوؤں سے آنکھ جل تھل آج بھی وہ ہے سو ہے
کل تھا اک راون مگر ہے راونوں کی فوج آج
تھا جو دھرتی پر امنگل آج بھی وہ ہے سو ہے
اس روز وہ عصمت دری ہے، قتل و اغوا بھی وہی
خوف و دہشت ہر سو ہر پل آج بھی وہ ہے سو ہے
جی مرنا وہی مر مر کے جینا بھی وہی ہیں ؎
جینا مرنا وہ بھی پل پل آج بھی وہ ہے سو ہے
تھا کہیں دارالاماں، عرصے سے ہے دارالمحن
درد کے ماروں کا مقتل آج بھی وہ ہے سو ہے
دو قدم چلتے ہی سانسیں پھول جاتی ہیں مری
دل کا پھر دردِ مسلسل آج بھی وہ ہے سو ہے
ناتوانوں کو کیا کرتے ہیں مغلوب آج بھی
فیضی نیتاؤں کا چھل بل آج بھی وہ ہے سو ہے

رات کی بھیگی سویرے پر اندر ہیں کا ... کہتے منظر تھا ... وہ دل ہی

پریاں جیسے صبح پھیلائے لوک سے دیکھ رہی چھبتی کیتلی دھوپ موسم اپنا بچاؤ کرتے ہوئے ؎ وہ غزل کا رنگ کہاں، وہ جذبوں کا آہنگ کہاں شعروں میں کہاں کیف واثر، جب عشق آزار نہیں

سنہ ء

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی
Kohsar,Bhikanpur
Bhagalpur-812001

افسانہ

ٹکڑے میں بٹی میں

پھر بھی صفحہ 52 پر دو دو مقطعوں کا استعمال بھی لاجواب ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

میں اپنے آپ سے بے زار ہوں منظر۔ مرے وجود سے برہم ہیں کیوں اثر والے
وہ چاہتے تھے کہ ہو درد آگہی دل میں۔ کچھ ایسے لوگ تھے منظرؔ جنوں کے سر والے

غزل نمبر ۴۵ صفحہ ۱۰۹ کی غزل کا چونکانے والا مطلع ہی مقطع کے طور پر شروع ہوا ہے۔

حسنِ عروس فکر، دل دیدہ تر کا رنگ۔ منظرؔ یہ کائنات ہے ذوقِ نظر کا رنگ

مجھے یقین ہے کہ اپنی نوعیت کی یہ امتیازی کتاب سیاق و سباق کے حوالے سے شعری حلقوں میں اہم مقامات نہ صرف حاصل کر چکی ہے بلکہ آگے بڑھتی رہے گی کیونکہ اس میں آفاقی شاعری کے تمام اجزاء موجود ہیں۔

بالآخر منظر اعجاز کی شاعری کا میزانِ کُل یہی ہے کہ اُن کے شعر و سخن کا رنگ خوب نکھرا ہے۔ مثلاً' (۱) جہاں بھی پہنچی نظر رنگ تک (۲) مرجھایا ہونٹوں کا تبسم اُڑا ہوا تصویر کا رنگ (۳) رنگ رنگ ہر صبح کا منظر جیسے خواب دیوانے کا (۴) فسونِ رنگ تجلّی آب زار نہ دے (۵) یقین کا رنگ بھی ہے وہم کا غبار بھی ہے۔ (۶) میری تعبیر کا آئینہ مرے خوب کا رنگ (۷) حسنِ عروس فکر، دل برتر کا رنگ (۸) رنگ، خوشبو، گلاب کی سوگند! (۹) منفرد در رنگ یہ آہنگ غزل کا لے جا (۱۰) جو بھی تھا اک عالم نیرنگ تھا۔

نیز اُن کی فارسی زدہ شاعری میں اضافت کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ اس کے برعکس عطف کا استعمال آٹے میں نمک کے برابر ہے' جیسے سوز و ساز، من و عن، نیاز و ناز، ہندی الفاظ نہایت کم ہیں۔ گاڑھے لفظوں کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ چونکہ اُن کا کلام تمثیلات کا پیکر ہے' خاص و عام قاری کی سمجھ میں آ جائے تو کیا بات ہے! منظرؔ اعجاز کے ideolect پر اچھا تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

ہوتا جارہا ہے جواب خیر سے رؤف خیرؔ کی طرح ڈاکٹر بھی ہیں۔ ان کو دیکھتا ہوں تو ان کے برخلاف مجھے اُن پروفیسر حضرات کا خیالِ ناشاد آتا ہے جن کے تدریسی و ادبی کارناموں اور تنخواہ میں برابر ہر سال کئی صفروں کا اضافہ ہوتا جارہا ہے حالانکہ اللہ ربِّ خالق نے تمام پروفیسرس کو شب و روز ملا کر چوبیس گھنٹے ہی عطا کئے ہیں سب کو ان کی صحت سے زیادہ صحت مند یافت ملتی ہے اکثر و بیشتر اپنی ایک عدد اہلیہ اور ایک عدد سے زیاد بچّے رکھتے ہیں۔ پھر سب کو یکساں مواقع اور سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں تو میں حیرت بدرایونی نہیں حیرت بیجاپوری ہو کر افسوس کرتا ہوں کہ کیوں اکثر پرفیسرس تضیع اوقات میں اور چند ہی اساتذہ تخلیقِ ادبیات میں خود کو مصروف رکھتے ہیں۔ یہ غریب اُردو کے امیر پروفیسرس اپنی یافت کی میٹھی باولی میں مست ہو کر مالی ڈوبکیاں لگاتے ہوئے اپنی اضافہ ہوتی ہوئی گوشت پوست کی اولاد کی ہر ہر خواہش کو پورا کرنا زندگی کا حاصل جانتے ہیں تو پھر ان غفلت شعاروں کو معنوی اولاد یعنی کتابوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور دریافت کی اس گہری باولی جس میں تدریس، تحریر، تخلیق، تحقیق، تنقید، تبصرہ و تجزیہ کے انمول موتی چُھپے ہوئے ہیں ان کو ڈھونڈنا حاصل کرنا تو درکنار یہ اس میں جھانکنا تک گوارا نہیں کرتے۔ اس لئے کہ ان سہل پسندوں کے لئے یہ باولی کھاری باولی کہلاتی ہے یہ طوطا چشم نظریں چُرانے کے لئے سیاہ چشمہ لگائے اُردو زبان کی فکر اسکی بقاء کے متعلق نہیں بلکہ اپنی ازدواجی مہ لقاء کے بارے میں ہی فکر مند

رہتے ہیں۔ تو صابر صابر و شاکر بن جاؤ کہ ایسے بھرتی کے پروفیسرس کی بھیڑ میں شُکر ہے ہمارے درمیاں ایک ایسا عجیب نوجوان شخص بھی موجود ہے جوان آرام طلبوں اور سہل پسندوں کو اپنے قلمی کارناموں کی بناء پر گویا کہہ رہا ہو کہ مت سہل جانو ہمیں۔

ہم سب کے لئے خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ مرزا غالبؔ کی طرح شاعر

آج کی اس خوشگوار تقریب میں نہ جانے کیوں مجھے ایک ناخوشگوار خیال یاد آرہا ہے۔ یوں بھی اشیا اپنی ضد سے ہی پہچانی جاتی ہیں۔ وہ جو سرسید کے ہی نہیں ہمارے آپ کے اور سب کے چچا مرزا غالب فرما گئے ہیں:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو۔ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تو آج کی اس تہنیتی محفل کے روح رواں مجھ سے کئی برس جواں عمر جواں، فکر جواب ذکر جواں کام و گام والے غضنفر اقبال جن کا اب قلمی و تصنیفی اقبال بُلند سے بُلند تر

نہیں ہیں لیکن ان کے لئے خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ غالبؔ کی طرح ہمسایۂ خدا ہیں اور برخلاف غالبؔ یہ درِ مسجد وا ہونے سے پہلے ہی وہاں کھنچے کھنچے اور بعد میں سجدوں میں پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔ اور جب سارا عالم سوتا ہے تو تادمِ تحریر اپنی ایک عدد گھر یلو بانو اور اپنے ایک سے زیادہ عدد بچوں کو سلا کر بقول کنہیا لال کپور برج ہاتھ یعنی اُردو کا جگاتے ہیں۔ یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ مظلوم و معصوم بانو اپنے خوابیدہ مقدر کے ساتھ جاگتے ہی رہتی ہے اور ان کی توجہ کی طالب رہتی ہے شاید عزیزم غضنفر کی

سنہ ۶

حنیف سیّد، ۳۴/۱۲۔سوئی کٹرا۔آگرہ ۲۸۲۰۰۳۔(یو،پی)
موبائل۔9319529720

افسانہ

بویا پیڑ ببول کا

نصف بہتر برج بانو کو اپنے شوہر کام دار کو دوسری نصف بہتر سمجھتی ہوگی۔ بہر کیف بیشتر پروفیسرس جس وقت پارٹیوں میں دست تا ذہن مصروف رہتے ہیں اُس وقت غضنفر اقبال اُردو کی خدمت میں دست تا ذہن لگے رہتے ہیں اس کا پتہ شروع سے ہی ہے۔ چنانچہ جب بھی میں ان کو فون کرتا ہوں تو اُدھر سے ایک ہی مثبت کارآمد اُردو نواز جواب آتا ہے کہ اس وقت میں اُردو زبان کے اس کام میں مصروف ہوں یا اُردو ادب کے اس پراجیکٹ میں منہمک ہوں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میرا اور ان کا رشتہ وہی ہے جو مرزا غالبؔ اور سرسید احمد خاںؔ میں تھا۔ ازراہِ شفقت میں ان کو اپنا بھتیجہ کہتا ہوں تو مجبوراً جواب میں ازراہِ شرافت و مروت ان کو مجھے چچا کہنے کے علاوہ کوئی دوسرا رشتہ نہیں ہے پھر مجھے یاد سے مبارک بادی دیتے ہیں کہ فلاں رسالہ میں آپ کی تخلیق مقامِ حیرت کہ دیکھی اور مقامِ عبرت کہ پڑھی بھی۔ پھر میں نے تہیہ کرلیا کہ اب کی بار کسی دور دراز علاقہ کے رسالہ میں افسانے بھیج کر دیکھتا ہوں کہ یہ میرا کہاں تک قلمی تعاقب کرتے ہیں۔ میرے یکے بعد دیگرے دو افسانے پتہ نہیں کیسے اننت ناگ کشمیر کے رسالہ ''لفظ لفظ'' اور کلکتہ کے رسالہ ''انشاء'' میں شائع ہوئے۔ میں مسکرا رہا تھا کہ یہاں غضفر کو پیچھے چھوڑ دیا۔ لیکن میرے مسکرانے کی مدت کو ختم کرتے ہوئے اس باخبر بھتیجے کا فون آیا آپ کے افسانے میں نے انشاء اور لفظ لفظ میں سچّی سچّی لفظ لفظ اپنی وہی بری عادت سے مجبور ہو کر شروع سے آخر تک پڑھے۔ لیجئے لوگ ہمیں مسکرانے کی مہلت بھی نہیں دیتے اور فوراً اپنا معلوماتی بریک لگا دیتے ہیں تو پھر ایسے عالم میں مرحوم جوشؔ پہلے ملیح آبادی بعد میں کراچی بربادی اپنے مشہور مصرع ''یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے'' کے ساتھ یاد کیوں نہ آتے۔ بہر کیف اس سے اندازہ ہوتا ہے یہ جناب اُردو دنیا سے کس قدر باخبر ہیں اور اُردو کو اپنے اوپر طاری کرلیا ہے اور ان کے پاس کتنے رسائل آتے ہیں۔ جبکہ وہی بھیڑ والے پروفیسر اُردو کا ایک اخبار تک نہیں خریدتے۔ لوگ مقامی ایوارڈ پاکر ہی مغرور ہو جاتے ہیں۔ یہ قومی ایوارڈ پاکر بھی مغرور نہیں اور مصروف ہو گئے جس کا ثبوت ان کی تحریر و مرتب کردہ دس کتابیں ہیں اور اب یہ تازہ ڈاکٹر وہاب عندلیب پر عرق ریزی، جانفشانی اور محنت سے تحریر و مرتب کردہ کتاب منظر عام پر لاکر اپنی اُردو دوستی کا ایک اور ثبوت پیش کئے ہیں کہ دیکھو ہم قابلِ تحسین ہی نہیں قابلِ تقلید بھی ہیں۔ اس کتاب کے ایک ایک صفحہ سے ان کی اردو اور سچ مچ اُردو کے آدمی ڈاکٹر وہاب عندلیب کے تئیں اُلفت و یگانگت جھلکتی ہے اور ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ دوسرے پروفیسرس کے برخلاف اپنا زیادہ وقت گیسوئے اُردو سنوارنے میں ہی گزارتے ہیں۔ بہت بہت مبارک بادی کے مستحق ہیں پروفیسر ڈاکٹر حمید سہروردی کہ ان کے ایک انجینئر فرزند خرم عماد ''باادب'' ہیں تو دوسرے فرزند ڈاکٹر غضفر اقبال ''بااُردو ادب'' ہیں۔

غضفر اقبال کے مزاج و برتاؤ میں نہیں کا سلسلہ ہاں تک نہیں بلکہ ہاں کا سلسلہ ہاں تک ہی ہے۔ اس لئے کہ جس کسی نے ان کو اُردو سے متعلق کوئی کام سونپنا چاہا تو یہ اپنے تدریسی اور غیر تدریسی (وہی بیوی بچوں والے کام) مصروفیت کے باوصف لبیک کہتے ہوئے دیئے ہوئے۔ کام کو خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچاتے ہیں۔ چاہے وہ جناب صابر فخر الدین (یادگیر) کے افسانچوں کا مجموعہ ہاتھ سے نکلا ہوا وقت ہو یا رؤف خوشتر کی آنے والی خلاف توقع سنجیدگی سے تحریر کردہ سنجیدہ تخلیقات پر مشتمل کتاب رنگِ تحریر کی ترتیب و تہذیب ہو۔ یہ اُردو سے متعلق ہر چھوٹا بڑا کام بلا جھجھک خندہ پیشانی و شادمانی و خوش دلی سے کرتے ہیں۔

آخر میں میں اپنے اس لائق قابل صالح اُردو کاموں میں مصروف بھتیجہ جسے اُردو دُنیا ڈاکٹر غضفر اقبال سہروردی کے نام سے جانتی ہے کہ حق میں دل سے دعا گو ہوں کہ اللہ رب مجیب وقوی انہیں صحت مند رکھے تاکہ ہمیں ان کے صحت مند انگلیوں سے تخلیق شدہ اُردو ادب کے صحت مند مواد کو پڑھنے کا اور موقعہ ملے

(آمین ثم آمین)

(یہ خاکہ گلبرگہ میں ڈاکٹر غضنفر اقبال کی تازہ مرتب شدہ کتاب میں ''ڈاکٹر وہاب عندلیب شخصیت اور ادبی صفر'' کہ رسم اجراء کے موقع پر مورخہ ۱۹؍فروری ۲۰۱۷ء کو پڑھا گیا)

☆☆☆

(میدانِ طنز و مزاح کا آئیکون۔۔۔۔کا بقیہ)

ہی مطمئن ہو جاتے ہیں۔ بار بار لکھنے یا کاٹ چھانٹ کی انھیں ہرگز نوبت درپیش نہیں آتی۔ البتہ اشاعت کے پیش نظر احتیاطاً خام مسودہ کو از سر نو تحریر کرتے ہوئے اس کی نوکِ پلک ضرور سنوارتے ہیں۔ منظور وقار کو چالیس سالہ اپنی ادبی کاوشیں اور کارگزاری پر اطمینان قلب حاصل ہے تاہم ان کی منکسر المزاجی کے باوصف وہ آج بھی کچھ نیا سیکھنے اور اپنے آپ کو اردو نثر کی باریکیوں، نزاکتوں اور لطافتوں سے ہم آہنگ ہونے کی سنجیدہ کوشش میں جٹے رہتے ہیں۔ ۳۳ سالہ بے داغ سرکاری خدمات سے سبک دوش ہو کر وہ مزید فعال، چاق و چوبند اور متحرک نظر آتے

ہیں۔ڈھلتی عمر میں ایک ادیب میں جتنا دم خم ہونے کی ضرورت درکار ہے اس سے کہیں زیادہ وہ چست اور تازہ دم دکھائی دیتے ہیں۔جسمانی خدوخال سے ان میں ابھی بزرگی کے آثار نمایاں دکھائی نہیں دیتے۔فرنچ کٹ سیاہ داڑھی سے نکھرا متبسم چہرہ ہمیشہ ہشاش بشاش ہی نظر آتا ہے جوان کی ذہنی وقلبی آسودگی کا مظہر ہے۔ان کا ظاہر و باطن کھلی کتاب کی مانند ہے۔بغض' کینہ' کپٹ اور منافرت جیسے خبیث جذبات سے عاری اس انوکھے فن کار کے اعلیٰ اوصاف وفنی عظمتوں کو صد ہزار سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔

☆☆☆

خالد حسینؔ

خالد حسین کا شمار ریاست کے موجودہ دور کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں عصر حاضر کی عکاسی کی ہے۔ان کے افسانوں میں کشمیر کی تاریخ، تہذیب وثقافت،ظلم و بربریت اور خوف و دہشت جھلک رہا ہے۔ 'ستی سر کا سورج' کشمیر کی تاریخ کے حوالے سے اُن کا شاہکار افسانہ ہے۔اس میں خالد صاحب دراصل اس تہذیب کی یاد تازہ کراتے ہیں جس کی سنگِ بنیاد صوفیوں نے رکھی تھی۔افسانہ کا مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:

''بلبل شاہ کی کملی اور شاہ ہمدان کے کلس میں دیکھو کھیت کھلیانوں اور کسیر کیاریوں میں جاؤ۔اپنی زبان اور ثقافت میں تلاشو''۔[1]

''لکیر'' افسانہ میں انہوں نے ہجرت کا المناک واقعہ اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے حالات وواقعات پر روشنی ڈالی ہے۔

نور شاہ

نور شاہ گذشتہ پچاس سالوں سے لکھ رہے ہیں۔اب تک انہوں نے افسانوں کے چھ مجموعے یادگار چھوڑے ہیں۔ان میں نور شاہ نے ان لوگوں کے مسائل پیش کئے ہیں جو نامساعد حالات کی وجہ سے اقتصادی و معاشی طور دوچار ہوئے ہیں۔علاوہ ازیں انہوں نے اپنے افسانوں میں گلمرگ، پہلگام، ٹنگمرگ اور یوسمرگ کا تذکرہ کیا ہے۔یہاں کے دلفریب مناظر اور کشمیری لوگوں کا حُسن ان کے افسانوں میں جلوہ گر ہے۔کشمیر کے لوگ شریف النفس، قدر کے پیکر، ذی شعور اور ان کے دل محبت سے لبریز ہوتے ہیں۔وہ دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھ کر ان کے غم میں

شریک ہوتے ہیں۔یاتریوں کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔''میرے حصے کا خواب'' افسانے کا سیاح کردار ان لوگوں کے متعلق یوں کہتی ہے:

''لوگ بُرے نہیں ہیں، جہاں تک میں جان پائی پُرخلوص اور محبت کرنے والے ہیں''۔[2]

تصحیح

گزشتہ شمارے میں صفحہ 59 پر احمد امام بالاپوری کی ایک غزل شامل ہے جس کے پانچویں شعر کے مصرعِ ثانی میں ردیف کی غلطی رہ گئی ہے۔درست شعر نوٹ فرمائیں:

انا کی پرورش کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے
یہاں جاگیریں کم پڑتی ہیں کاروبار جاتے ہیں

ریاستِ جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کی موجودہ صورتحال روشن اور تابناک ہے۔کیونکہ ریاست کے تینوں خطوں میں اس وقت ادیبوں کی کثیر تعداد موجود ہے جو سرگرمی کے ساتھ افسانے لکھ رہے ہیں۔ان میں خالد حسینؔ، نور شاہ، پروفیسر حامدی کاشمیریؔ، مشتاق مہدیؔ، عمر مجیدؔ، غلام نبی شاہدؔ، اشرف آثاریؔ، ڈی کے کنولؔ، آنند لہرؔ، زنفر کھوکرؔ، ڈاکٹر سیدہ نگہت فاروقؔ، ترنم ریاضؔ، زاہد مختارؔ، عبدالغنی شیخ لداخی اور دیپک بدکیؔ شامل ہیں۔لیکن یہاں میں چند ادیبوں کا تذکرہ ہی کر سکتا ہوں کیونکہ پیپر مختصر ہوتا ہے۔

افسانہ

شرافت حسین
Mohlla qazipura Tanda
Ambedkar nagr U.P.
MOB. NO. 08090 095912

رشتہ

مشتاق مہدیؔ

مشتاق مہدی ڈراما نگار، شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔افسانہ نگاری کا آغاز انہوں نے ۱۹۷۳ء میں کیا جب ان کی پہلی کہانی ''کمینہ'' کے عنوان سے بمبئی کے ماہنامہ فلم سنسار میں شائع ہوئی۔انہوں نے علامتی انداز اختیار کر کے اپنے افسانوں میں معانی آفرینی پیدا کی ہے۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں یہاں کے صوفی بزرگوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔'سچ کیا ہے' افسانہ میں انہوں نے کشمیر کے مشہور صوفی بزرگ حضرت پیر دستگیر صاحب کی راست بازی کا تذکرہ کیا ہے۔اور ساتھ ساتھ انہوں نے اس افسانہ میں یہاں کے خوبصورت مناظر کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ملاحظہ ہو:

''پیاری سی دھوپ نکل آئی تھی۔آس پاس کھڑے پہاڑوں پر جمی سفید برف چاندنی کی مانند چمک رہی تھی...........سارا منظر دُھلا دُھلا سا لگ رہا.....''۔[۳]

حامدی کاشمیریؔ

حامدی کاشمیری وادی ادب میں ایک اکائی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ان کی شخصیت میں کئی شخصیتیں پوشیدہ ہیں۔وہ ناول نویس، افسانہ نگار، ناقد اور محقق کی حیثیت سے اُردو ادب میں مشہور ہیں۔بیسویں صدی کا افسانہ نمبر میں حامدی کاشمیری کی افسانہ نگاری کا جائزہ یوں پیش کیا گیا ہے:

''اور یہ ہیں پروفیسر حامدی جن کے خدوخال ہی ان کے کشمیری ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔آپ کشمیری عوام کی روح میں اتر کر کہانیاں لکھتے ہیں۔اُردو افسانہ نگاروں کی جدید ترین پود میں شاید آپ سب سے کم عمر لیکن غضب کے طباع اور باشعور افسانہ نگار ہیں''۔[۴]

حامدی کاشمیری کے افسانوں میں یہاں کی سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی حالات کے ساتھ ساتھ کشمیری ماحول، رہن سہن اور طرزِ زندگی جلوہ گر ہے۔

(بقیہ صفحہ 56 پر)

سنہء

غزلیات

مختار احمد کوثر

C-66,KareliColony
Allahabad-211016(U.P)
Mob-9956069015

مینا بھری بھری نہ ہی ساغر بھرا بھرا
بیٹھا تھا مجھ سے بزم میں دلبر بھرا بھرا
جب تک مزاجِ بحر میں دریا دلی نہ ہو
آنکھوں کو خوش لگے نہ سمندر بھرا بھرا
کیوں مجھ کو یہ گمان ہے میں خود پہ بوجھ ہوں
کچھ تو ضرور ہے مرے اندر بھرا بھرا
دل رو پڑا ہے بیٹوں کو پردیس بھیج کر
لوگوں نے جب کہا تھا کبھی گھر بھرا بھرا
ساقی نے میکدہ میں بڑھایا تھا خالی جام
بیٹھا تھا غالباً تبھی کوثر بھرا بھرا

پی پی سریواستو رند

R-16,Sector-XI,Noida-201301
Mob-09711422058

ناکامیوں کی دھوپ عجب کام کر گئی
سورج جلا کے میری ہی چوکھٹ پہ دھر گئی
جب بے گھری جنون کی حد سے گزر گئی
ہجرت کی ضد مجھی کو لیے دربدر گئی
جب بھی دھواں دھواں ہوا راتوں کا سلسلہ
تہمت تمام بجھتے چراغوں کے سر گئی
سنّاٹے ناپتے رہے راتوں کا طول و عرض
مایوسیوں کی فصل تو تنہائی چر گئی
مجھ کو لگا کہ کانچ کے پر ٹوٹنے لگے
اک شرط تھی اڑان کی جو کام کر گئی
زخموں کے انتشار کو کھونٹی پہ ٹانگ کر
زندہ کسک تھی جسم کی، رگ رگ میں بھر گئی
اے رندؔ اب رتوں کا کھنڈر رہ گیے ہیں ہم
چشمِ زدن میں ساری جوانی گزر گئی

عبدالحی پیام انصاری

At/P.O:PiprauliBazar.
Via:Khajni.Gorakhpur-273212
Mob-9453814135

چمن کو میرے جس نے کھل کے مہکایا بہت تھا
مرے گلدان میں وہ پھول کملایا بہت تھا
کھلونا جو سمجھ کر کھیلتا تھا میرے دل سے
خود اپنے دل کے زخموں پر وہ پچھتایا بہت تھا
دلِ بے تاب قابو میں نہ رہ پایا جب آخر
تجاوز حد سے کر کے مجھ سے شرمایا بہت تھا
اسی پل تم اسے جیسے بھی چاہے موڑ لیتے
وہ لوہا آگ میں جل جل کے گرمایا بہت تھا
کبھی دو بات ہنس کر جس سے کی تھی چلتے چلتے
وہ چہرہ زندگی بھر مجھ کو یاد آیا بہت تھا
مجھے موقع نہ مل پایا کہ کہتا شکریہ میں
مری غزلوں کو جس نے بزم میں گایا بہت تھا
کوئی اب لاکھ سمجھائے کہاں رکتے ہیں آنسو
پیامؔ اس دل کو لیکن میں نے سمجھایا بہت تھا

عظیم الدین عظیم

PlotNo-78/427,LotusGarden
Jadupur.Bhubaneswar-751019(Odisha)

وہ میرے شعر پہ تنقید بہت کرتے ہیں
ان کی باتوں کے مفاہیم بڑے گہرے ہیں
جانے کب تک وہ رکیں گے مجھے معلوم نہیں
قافلے درد کے جو دل میں مرے ٹھہرے ہیں
میری حالت پہ تسلی مجھے دیتے ہیں بہت
میرے احباب سبھی دل کے بڑے اچھے ہیں
اپنی باتوں کو کوئی کھل کے نہیں کہہ سکتا
حاکمِ شہر کی جانب سے لگے پہرے ہیں
سلسلہ ظلم کا جاری ہے ہر اک سمت عظیمؔ
لوگ سب اپنے یہاں آج ڈرے سہمے ہیں

علیم الدین علیم

P-69,MudialiRoad
GardenReach-Kolkata-700024

اجنبی ہی میں رہوں گا اجنبی کے سامنے
حالِ دل اپنا سناؤں کیوں کسی کے سامنے
خون کے آنسو پلائے جب مجھے میری انا
چیخ اٹھے بے تاب دریا تشنگی کے سامنے
دیکھ کر تجھ کو اچانک آ گیا مجھ کو خیال
نیم کا اک پیڑ تھا تیری گلی کے سامنے
تجھ سے بہتر کون میرے دل سے واقف ہے
بتا
یہ سدا جھکتا ہے اک تیری رضا کے سامنے
ہوگا کیا معصوم کا انجام گلشن میں علیمؔ

احمد ندیم مورسنڈوی

At/P.O:Morsanda.Via:Korha
Dist-Katihar-854108(Bihar)

میرا بچپن اے خدا مجھ کو دوبارہ گر ملے
میں جھکاؤں گا ترے آگے مجھے وہ سر ملے
ننھی منی سی شگفتہ اس کلی کے ہونٹ پر
مسکراہٹ کا تر و تازہ سدا منظر ملے
توڑ لاؤں گا ستارے اس کلی کے واسطے
آسماں چھونے کی خاطر گر مجھے شہپر ملے
آپ سے بڑھ کر کسی کو میں نے تو دیکھا نہیں
گرچہ میری راہ میں اکثر کئی رہبر ملے
نفرتوں کا زرد موسم ہے ابھی ٹھہرا ہوا
اور محبت کے سبھی خطے مجھے بنجر ملے
روشنی کو ڈھونڈنے نکلا کبھی جب میں ندیمؔ
راستے میں مجھ کو لیکن رات کے لشکر ملے

سنہ ء

قربان آتش
KhatariMohalla.
P.O:Ara-802301(Bihar)

تو مجھ کو جان کے کاغذ کبھی لپیٹ نہیں
سلگتی ریت ہوں اپنی طرف سمیٹ نہیں
میں اپنے بچوں کو اسکول بھیجتا کیسے
کبھی کتاب نہیں اور کبھی سلیٹ نہیں
اٹھا کے پھینکیے مجھ کو نہ خاکدانوں میں
شکستہ ساز ہوں ٹوٹی ہوئی پلیٹ نہیں
ہمارے شہر کا دستور ہی نرالا ہے
کسی بھی شے کا مقرر تو کوئی ریٹ نہیں
میں اپنے جسم کے آنگن میں کس طرح جاتا
یہ وہ مکان ہے جس میں کہ کوئی گیٹ نہیں

مضطر مچھلی شہری
At:MahtwanaP.O:MachhliShaher
Dist:Jaunpur-222143(U.P)

میری نیکی کا اک قطرہ اس کو دریا لگتا ہے
وہ مجھ کو دریا بھی دیدے مجھ کو قطرہ لگتا ہے
خونی رشتے سے بہتر اب درد کا رشتہ لگتا ہے
بات پتے کی کہتا ہوں میں آپ کو کیسا لگتا ہے
عقل مری حیران ہے یارو دور یہ کیسا لگتا ہے
سچا جھوٹا لگتا ہے اور جھوٹا سچا لگتا ہے
یہ کون آیا میرے گھر میں ایسا کچھ محسوس ہوا
جگ مگ جگ مگ میرے گھر کا کونا کونا لگتا ہے
دیر سے میرے بیٹھے کھانا پانی لے کر اس کو دے آؤ
پیڑ کے نیچے ایک مسافر بھوکا پیاسا لگتا ہے
میٹھی پیاری پیاری باتیں اس کی چہرہ بھولا بھالا سا
میرے ہمسائے کا بچہ سب کو اچھا لگتا ہے
یہ کس نے افواہ اڑائی مضطرؔ دنیا چھوڑ گیا

مفتاح اعظمی
23,P.B.MByeLane.Champdani
Hooghly-712222(W.B)

اس کا پیام لے کے صبا آیے گی ضرور
کانوں میں میرے اس کی صدا آیے گی ضرور
یہ سوچ کے نکل پڑا صحرا کی دھوپ میں
اک روز میری سمت گھٹا آیے گی ضرور
شہرت پہ اپنی فخر جو کرتا ہے ہر گھڑی
ظاہر ہے اس بشر میں انا آیے گی ضرور
نادم جو ہو گا اپنی خطاؤں پہ برملا
اپنے کیے پہ اس کو حیا آیے گی ضرور
ماں کو ہمیشہ رہتا ہے میرا خیال جب
مشکل میں کام اس کی دعا آیے گی ضرور
رہتے ہو بند کمرے میں گھٹ گھٹ کے کس لیے
کھولوگے کھڑکیاں تو ہوا آیے گی ضرور
مفتاحؔ ذاتِ باری سے انکار ہے جسے

محمد واثق پلوگویں
Vill:Pusgawan.P.O:Vazeer
Ganj.Dist:Budaun-202562
Mob-8954377876

سرکشی میں جو کہ چٹان سے ہوجاتے ہیں
پانی پانی وہ بھی احسان سے ہوجاتے ہیں
چارہ سازوں سے کوئی زہر طلب کرتا ہے
اتنے بیزار کہیں جان سے ہوجاتے ہیں
وہ جب تری یاد کی برسات نہیں ہوتی ہے
ذہن و دل ریت کے میدان سے ہوجاتے ہیں
خوشبو کو دکھ تو وہ دیتے ہیں ناکامی سے بڑھ کر مجھ کو
قید کامیابی کے جو امکان سے ہوجاتے ہیں
جب کوئی اپنا دکھائی نہیں دیتا واثقؔ
شہر کے شہر بیابان سے ہوجاتے ہیں

مسلم نواز
C/O:BaitulQasim
12/3/H1PatwarBaganLane
Kolkata-700009.MOb-9681811271

تمام عمر تو گزری مری فقیری میں
بہت سکون ملا مجھ کو دست گیری میں
ہے مرا چاک گریباں تو مسکراتا ہے
یہ میرا حال ہوا ہے تری اسیری میں
اسی کے حق میں دعاؤں کے پھول برسائے
ملی ہے چوٹ مجھے جس کی ہم سفیری میں
نظر اٹھا کے فلک سے نظر ملا نہ سکا
کمان جیسے بدن ہوگیا ہے پیری میں
مجھے سند سے نوازا گیا دمِ آخر
کہ عمر بیت گئی جب مری دبیری میں
نوازؔ خاک کا بستر اسے نصیب ہوا
زمیں پہ پاؤں جو رکھتا نہ تھا امیری میں

یونس عاصم
Dhenkanal(Odisha)
Mob-7789811686

تھوڑا شیریں کلام بھی رکھیے
اپنے لب پر سلام بھی رکھیے
مت جائیں پہ دلکشی کی صبح
اپنی نظروں میں شام بھی رکھیے
جب سیاست میں آپ آیے ہیں
اپنے مطلب کا کام بھی رکھیے
کیا خریدیں گے آپ منڈی سے
اپنے کھیسے میں دام بھی رکھیے
سب کی نظریں ہوں آپ پر مرکوز
اپنا اونچا مقام بھی رکھیے
سب سمجھ لیں گے اس کو پھر عاصمؔ
شعر میں لفظِ عام بھی رکھیے

کی کوشش کر رہی تھی۔ خیالات کے پرندے کو وہ پرواز دیتی رہی۔ آخر جہیز کی لعنت ختم کیوں نہیں ہوتی۔ اکیسویں صدی کے سولہ سال گزر گئے۔ آج بھی مجھ جیسی لڑکیاں بیاہی جانے کے انتظار میں کنواری بیٹھی ہیں۔ کاش اپنا سکھ چین ہوتا۔ بھرے پرے سے ہاتھوں زندگی کو چھونے کی خواہش اس کے چہرے پر چمک پیدا کر گئی۔ روشنی ہر سو پھیلنے لگی۔ وہ اپنے زندہ ہونے اور زندگی جینے کا ثبوت دینے کے لئے بے چین ہوگئی۔ لیکن ایسے خیالات لمحہ بھر کے لئے مچلے، اور اس نے

مرغوب اثر فاطمی
RoadNo-7,MohallaAliGanj
Gaya-823001(Bihar)
Mob-9431448749
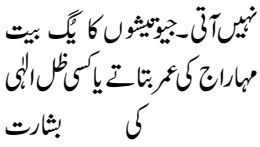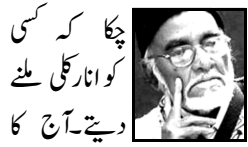
دونوں وہ آنے کو ہیں، آجائیں، طبیعت کچھ سنبھل جائے ہاتھ خالی ہیں۔ یہ وہ
ہاتھ ہیں اگر ہے موت بھی آنی تو تھوڑی دیر ٹل جائے جن کی

یہ مانا وقت بدلا، رنگ بدلے آپ کے حضرت
پسینہ میرے حصے میں ترے حصے میں پھل جائے
ذرا سنگینیٔ حالات کی سدھ لے دلِ ناداں
ہو محوِ خواب تُو اور وقت اپنی چال چل جائے
وہ خالق بھی محافظ بھی ہے اس کا فیصلہ برحق
کہاں بھیجے ابابیلیں کہاں ٹڈّی کا دَل جائے
فرازِ آشنائی ہے دوئی کا پردہ ہٹ جانا
کسی کا نام لب پر ہو، کسی کا دم نکل جائے
سمندر نے ہماری تشنگی سے رائے مانگی تھی
کہا ہے زندگی نے جب بھی جائے برمحل جائے
اثرؔ چل گاؤں سے لے آئیں تھوڑا صبح کا منظر
ادھر میٹھی اذاں گونجے ادھر کھیتوں میں ہل جائے

کرشن پرویز
Kharar.Dt:Mohali-140301(Punjab)

سیاست میں اداکاری تو پہلے سے بھی بڑھ کر ہے
ہراک لیڈر میں مکاری تو پہلے سے بھی بڑھ کر ہے
کوئی بھی کام آسانی سے ہوجایے نہیں ممکن
ہراک دفتر میں دشواری تو پہلے سے بھی بڑھ کر ہے
کروڑوں کا ہے ٹھیکہ، خرچ ہوتے ہیں مگر لاکھوں
یہ بندر بانٹ سرکاری تو پہلے سے بھی بڑھ کر ہے
کہیں دنگے، کہیں ڈاکے کہیں پر قتل وغارت ہے
گلی کوچے میں مے خواری تو پہلے سے بھی بڑھ کر ہے
ہراک لیڈر کا دعویٰ ہے ترقی ملک نے کرلی
وطن میں بھوک بیکاری تو پہلے سے بھی بڑھ کر ہے
لگائے آگ لیڈر پھر بجھانے بھی چلا آیے
بنا تلوار دودھاری تو پہلے سے بھی بڑھ کر ہے

ڈاکٹر مظفر عالم ضیا عظیم آبادی
DarunNishat.Daryapur.Patna-4

زندگی میں بے بسی پہلے کبھی ایسی نہ تھی
بے رخی بھی آپ کی پہلے کبھی ایسی نہ تھی
زندگی کی دل لگی پہلے کبھی ایسی نہ تھی
ہائے ایسی بے کلی پہلے کبھی ایسی نہ تھی
اس طرح انسانیت دم توڑتی ہے آج کل
خوں میں لت پت زندگی پہلے کبھی ایسی نہ تھی
تنگ دستی میں گزارا کرلیا کرتے تھے ہم
اب ہے جیسی مفلسی پہلے کبھی ایسی نہ تھی
پہلے بھی سفاکیاں انسان کی فطرت میں تھیں
بربریت آج کی پہلے کبھی ایسی نہ تھی
نوجوانوں میں ضیاؔ پہلے بھی ہوتی تھی مگر
اب جو ہے بے رہ روی پہلے کبھی ایسی نہ تھی

حفیظ فاروقی۔ کریم نگر

دیدۂ دل سے وہ دیدار کراؤں تیرا
اپنے دیوانے کو دیوانہ بناؤں تیرا
کس نے رنگین کیا حسنِ نظر سے دل کو
لوگ پوچھیں گے تو کیا نام بتاؤں تیرا
قریۂ بیت میں روشن ہیں قوافی میرے
ہے ردیف ایسی کہ ہر وصف دکھاؤں تیرا
تشنہ لب رند بلا نوش بہت ہیں ساقی
ہو اگر اذن تو میخانہ بساؤں تیرا
بے وفا کوئی نہیں، وہ بھی نہیں، میں بھی نہیں
زندگی مان بھی جا جشن مناؤں تیرا
فرش سے عرش تلک روز ہی جاتا ہے خیال
رنگ ہی رنگ ہیں کیا رنگ دکھاؤں تیرا
میرے سجدوں کی ہے توقیر، نہ وقعت کوئی
کس طرح تو ہی بتا قرض چکاؤں تیرا
حسرت و یاس میں مرنے سے تو بہتر ہے حفیظؔ
بے غرض ہو کے جیوں مان بڑھاؤں تیرا

عظیم انصاری
RahmatManzil,20/2.B.P.Road
Jagadal.North24Parganas-743125
Mob-9163194776

اب کہاں اہلِ جفا صدق وصفا کے طالب
مرگئے لوگ جو تھے صبر و رضا کے طالب
نظر اپنی دنیا کا برا حال نہ ہوتا اتنا
کاش ہوتے جو جہاں والے جزا کے طالب
یوں تو عریاں ہے بہت آج ہماری دنیا
پھر بھی کچھ لوگ مسلسل ہیں حیا کے طالب
روشنی گھر کی کہاں دیتی ہے راحت ان کو
دل کے مارے ہیں ستاروں کی ضیا کے طالب
کل جو کشتی کو بہر حال بچالیتے تھے
ہوگئے آج وہی موجِ بلا کے طالب
صاف گوئی کی فضا لگتی ہے اچھی مجھ کو
دھوکے کھاتے ہیں بہت حسنِ ادا کے طالب
جیت پاتی ہیں کہاں ہم سے بلائیں بھی عظیمؔ
ہم سدا سے ہیں بزرگوں کی دعا کے طالب

شفیق الایمان ہاشمی
R.No:27,SanjayNagar.Near
SatsangBhawan.ShivajiNagar.
GovindiMumbai-400047

محفل میں جا کے بیٹھوں تو تنہائیوں کا خون
اور گھر کی راہ لوں تو شناسائیوں کا خون
ان سے کہو کہ حشر کا دن اب نہیں ہے دور
اُس دن تو رنگ لائے گا برنائیوں کا خون
اورنگ زیب! تجھ کو قسم تو نہ پی اسے
یہ بھائیوں کا خون ہے رے! بھائیوں کا خون
ملتا ہے جب عروج کسی کم شناس کو
ہوتا ہے سب سے پہلے شناسائیوں کا خون
اے دوست! تو اشوک کی لاٹوں سے لے سبق
تڑپائے گا تجھے ترے شیدائیوں کا خون
خسرو کے پیر ملتے تو ان سے میں پوچھتا
کس کس طرح سے ہوتا ہے دارائیوں کا خون

رضوان احمد رازؔ (فتح پور)

لوحِ دل پر لکھا مٹاؤں میں
کس طرح تجھ کو بھول جاؤں میں
پہلے مشکل کھڑی کروں لاکھوں
اور پھر خود کو آزماؤں میں
مٹ
وصف گننے سے جو رہا قاصر
لکیروں عیب اپنے اسے گناؤں میں
بے معنی ساتھ لے آؤں میں تجھے اپنے
خود کو یوں تجھ میں چھوڑ آؤں میں
خواہش ساری دنیا سے ہو کے بے گانہ
کو خط اپنی دنیا تجھے بناؤں میں
نے بے خود کو کتنا ہی کرلوں زور آور
سے روز خود سے شکست کھاؤں میں
چلایا گفتگو سیکھنی ہے گر تم کو
آؤ غالبؔ کے خط سناؤں میں
اس نے مجھ کو بھلا دیا یکسر
رازؔ یہ کیسے بھول جاؤں میں

شوکت رشیدی

DewanBazar.Cuttack-753001
Mob-9337892064

تہذیب؟ غنچے بھی ہمارے ہیں مالی بھی ہمارا ہے
بے شک یہ چمن اپنا جنت کا نظارا ہے
چکی اس جنگ کے بارے میں کچھ کہنا نہیں ممکن
میں تلاش لشکر تو ابھی ہم نے میداں میں اتارا ہے
ہے۔ سورج کی تمازت تو اک دین ہے فطرت کی
شبنم میں نہ جانے کیوں پوشیدہ شرارا ہے
ہوئی، کسی اس دورِ تعصب میں رہنا ہے بہر حالت
لکھے، اس جینا بھی گوارا ہے مرنا بھی گوارا ہے
حد کرب مانا کہ ستم ان کا ہم پر ہی رہا لیکن
کاغذ پر قلم خود اپنی تباہی کو ہم ہی نے پکارا ہے
مانگے کے اجالے کا کوئی تو ہوا طالب
شہرت کا سمجھ لیجے اک یہ ہی سہارا ہے
تم اس کو بچانے کی تدبیر کرو شوکتؔ
طوفاں میں سفینہ ہے اور دور کنارا ہے

اس نے مزید
لکھا ''ماں
کئی طرح کے پھول
ہیں اور آپ کو پوچھتے
جواب دوں؟اور یہ
نے میرے متعلق
نہیں

روی سنگھ رانا (ایڈوکیٹ)

NerChowk.Mandi-175008(H.P)

اس جہانِ خراب میں بابا
زندگی ہے عذاب میں بابا باپ کے
جو ہیں معروف کیا پتہ ان کے گھر کے
کام کیا ہیں حجاب میں بابا آنگن میں
کوئی میکش نہیں ہے ہوش طلب کھلے ہوئے
ایسا کیا ہے شراب میں بابا
وقتِ پیری میں جا کے راز کھلا ہیں۔ کیا
کیا مزے تھے شباب میں بابا کہ آپ
وہ کراتا ہے ہجرتیں ایسا کچھ بھی
ہے اثر ناج و آب میں بابا
رہنماؤں نے جو کیا وہ تو
نہ تھا ان کے خطاب میں بابا
اتنی دنیا لگی ہے لانے میں
کچھ تو ہے انقلاب میں بابا
نہ تجربہ نہ دانائی شاہینؔ
کچھ نہیں تھا شباب میں بابا

شاہنواز انصاری

Mohalla:mahtwana.P.O:Machhli
Shaher.Jaunpur(U.P)
Mob-7398506948

والے''۔

دل میں وہ جوش وہ ہیجان نہیں پہلا سا اگر یہ جملہ کسی
اب تری دید کا ارمان نہیں پہلا سا افسانے کا عنوان
چاند، سورج بھی، ستارے بھی وہی ہیں لیکن ہوتا تو واقعی
ہائے افسوس کہ انسان نہیں پہلا سا خوبصورت ہے
یوں تو کہنے کو مسلمان ہیں ہم لوگ مگر لیکن اگر یہ
سچ تو یہ ہے کہ اب ایمان نہیں پہلا سا شکوے کی کوئی
گفتگو میں کہاں اخلاص نظر آتا ہے قسم ہے تو
آدمی ہے مگر انسان نہیں پہلا سا سچ، ایک دم غلط
شہنوازؔ آیا ہے میدانِ عمل میں تو مگر ہے۔
تجھ میں اللہ کا عرفان نہیں پہلا سا

نظام اختر

KhatriMohalla.Ara.Bhojpur
(Bihar)Mob-8539087470

______''بہت یاد آنے بجھا ہوا تھا کسی کو مگر خیال نہ تھا
چراغِ شہر پہ کیسے کہوں زوال نہ تھا
وہ جا رہا تھا اکیلا یہاں سے دور بہت
مگر خموش لبوں پر کوئی سوال نہ تھا
جدید راہوں سے گزرا تو مل گئی منزل
کہ اس سے پہلے مگر یار کا وصال نہ تھا
ہر اک شجر کا خزاں میں یہ حوصلہ دیکھا
بچھڑ کے پتوں سے اس کو کوئی ملال نہ تھا
ہجومِ شہر میں اس کی تلاش کی ہے بہت
اس آدمی کی طرح کوئی بے مثال نہ تھا
زمانہ مجھ کو بھلا دے گا بعدِ مرگ نظامؔ
یہ سوچ کر بھی مرے دل کو کچھ ملال نہ تھا

غلام سرور ہاشمی

GopalGanj(Bihar)
Mob:9771119044

راہِ مشکل میں قدم جو ہے بڑھانے والا
اپنی منزل کو یقینا وہ ہے پانے والا
تم مجھے دل سے بھلا دو یہ تمہاری مرضی
میں نہیں تم کو کبھی دل سے بھلانے والا
یوں تو مل جاتے ہیں دنیا میں بہت دوست مگر
کوئی ملتا ہی نہیں ساتھ نبھانے والا
جس کو میں دوست سمجھتا رہا ہر دم لیکن
اک وہی مجھ پہ تھا الزام لگانے والا
وقت کی قدر کرو دل سے ہمیشہ سرورؔ
کیونکہ یہ وقت نہیں لوٹ کے آنے والا

سنہ ۶

کتابوں کے شہر میں

(تبصرے کے لئے دو کاپیوں کا آنا ضروری ہے)

اگر اپنی کتابوں کا اشتہار بھی دیں تو تبصرہ ترجیحی بنیاد پر جلد شائع کیا جائے گا۔ایک صفحے کے اشتہار کی شرح ایک ہزار روپے ہے۔تبصرے کے لئے کافی کتابیں جمع ہو چکی ہیں۔ان پر تبصرہ ترتیب وار شائع ہوتا رہے گا۔(ادارہ)

پوچھا۔۔۔۔۔۔۔۔کیوں؟ میرا دایاں ہاتھ فریکچر کر گیا تھا، پھر شہر سے بیس کلومیٹر دور تبادلہ ہو گیا تھا۔ یہاں کے اسکول کا ماحول اچھا نہیں ہے۔ میں ٹھنڈی آگ بن گئی ہوں جو شاید کبھی ختم نہ ہو۔ آوازوں سے الجھتی میں بے موسم کی اداسی کے گھیرے میں قید ہوں۔ اب ہاتھ کا پلاسٹر کھلا ہے۔ روشنی کی کرنیں میرے آس پاس سرک رہی ہیں۔ سچی، آج بارش کافی جوش میں ہے۔ جب جب رومان کی رگ پھڑکتی ہے، کمبخت یہ بارش جان ہی تو لے لیتی ہے ۔کچھ اور مت سمجھ لیجئے گا۔ میرے

جادو ذہن کی گلیوں میں مل کر ایک رنگ ہو جاتے ہیں اور نیند کوسوں دور چلی جاتی ہے۔ یہاں سے آپ کے شہر تک ایک لمبا راستہ نظر کے سامنے رہتا ہے۔ اور معصوم جگنوؤں کی طرح روشنیاں جنم لیتی رہتی ہیں ۔اور شناخت کی ہار جیت میں جنگ شروع ہو جاتی ہے ، جب کہ میں جانتا ہوں کہ جنگ ایک بے معنی استعارہ ہے۔ تب آپ کوئی فرد واحد نہیں بلکہ ایک کیفیت کا نام بن جاتی ہیں۔ اور آپ جانیں، ہر کیفیت کی ایک عمر ہوتی ہے۔ لیکن ہماری عمر ابھی قبضے میں ہے۔ خدوخال کہاں بدلے ہیں، ابھی بہت آگے کا سفر طے کرنا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زندگی کی

(بقیہ صفحہ 67 پر)

اس جملے میں جنس سے متعلق کچھ بھی نہیں ہے۔ ہاں، دل ہے تو دھڑ کنے کا بہانہ ضرور چاہتا ہے، اور خاص کر اس موسم میں یہاں کے پہاڑوں اور یہاں کی ہریالی کے درمیان اگر دھڑکنیں خطا نہ کریں تو یقیناً کمبخت ہیں۔ میری تحریر کی چلبلاہٹ اور اداسی سے آپ سارا راز جان رہے ہوں گے۔ ویسے میں اس وقت کلاس روم میں ہوں۔ بچے ڈسپلین کا ثبوت دے رہے ہیں۔ گاؤں کے یہ سیدھے سادے بچے، ان میں سے بہت سے ننگے بھوکے ہیں۔ لیکن سرکار انھیں تعلیم یافتہ بنا کر شہری بنانا چاہتی ہے۔ کھڑکی کے باہر حد نظر تک کھلا سبز میدان ہے۔ دھان کے کھیت، کشادہ پہاڑ کی چوٹی سے نکلتا دھواں اور پھر بارش کی رم جھم، درخت حوصلہ مند مرد کی طرح کھڑے ہیں اور شاخیں مجھ جیسی شرارتی کی طرح آپس میں چہل بازیاں کر رہی ہیں۔ یہ سرشار ہو کر تالیاں بجانے میں مصروف ہیں۔ کھڑکی سے باہر پتلی پگڈنڈی کو دور تک دیکھ رہی ہوں۔ جیسے کسی نئی بیاہتا کی سجی مانگ ہو اور بوندیں ان میں افشاں سجا رہی ہوں۔ کیا یہ نظارے ہیں آپ کے پاس؟ نہیں نا! اچھا آیئے میری آنکھوں سے ان کا لطف لیجئے۔ اُدھر میدان میں پرندے شان بے نیازی سے خوش فعلیوں میں مصروف ہیں۔ اچھا ہی ہے کہ یہ انسان نہیں ہیں ورنہ زمانے کی فکر انھیں خوش فعلیوں سے محروم کر دیتی۔ میں موسم کی اسیر ہوں۔ لیکن آپ؟ اگر آپ جواب دیتے تو کیا لکھتے؟ شاید آپ کی تحریر ہوتی:

آپ لکھتی ہیں تو لگتا ہے کہ بول رہی ہیں۔ اور جب بولتی ہیں تو دل آپ کی مٹھی میں چلا جاتا ہے۔ اسے تو آپ بھی مانیں گی کہ الفاظ ہی سب کچھ نہیں ہوتے۔ انداز اور آواز کا بھی ایک جادو ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یادوں کا کارواں اور آواز کا

پاکستان اور کشمیر کے زلزلے کے قہر سے ساری دنیا دہل گئی تھی۔ اگلی صبح دوبارہ زلزلہ آنے کی اچانک افواہ سے چیخ پکار ہوئی، مکانوں میں یوں ہی سامان چھوڑ کر بھگ دڑ مچی، اذانیں گونجیں، گھنٹے بجے، دیکھتے ہی دیکھتے میدان، گلیاں اور سڑکیں بھر گئیں۔ سبھی اپنے اپنے معبودِ حقیقی سے رحم کے لیے گڑ گڑا رہے تھے۔ لگ رہا تھا کہ زلزلے میں پاکستان اور کشمیر کی طرح ان کے بھی مکان مسمار ہو گئے ہیں۔ گرستیاں چکنا چور ہو گئی ہیں۔ ان کے جانور اور وہ خود بھی ملبے میں دبے پڑے تڑپ رہے ہیں۔ ان کے سر پھٹ گئے ہیں۔ بھیجے نکل پڑے ہیں۔ ہاتھ پیر ٹوٹ گئے ہیں۔ پیٹ پھٹ کر آنتیں، دل گردے وغیرہ باہر آ گئے ہیں۔ بہت سے مر چکے ہیں، لاتعداد مر رہے ہیں۔ ایک کہرام مچا ہے۔ لوگ چیخ و پکار کر رہے ہیں۔ ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، پھر ایک دن، دو دن، پورے تین دن ہو چکے ہیں، اب چیخنے کی تاب نہیں ہے کسی میں ۔ بھوک اور پیاس سے نڈھال ہیں سب ، دم گھٹ رہے ہیں۔ ملبے میں دبے ٹوٹے پھوٹے جسموں کو رات کی لمبی بے پناہ ٹھنڈ نے یخ بستہ کر دیا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے گجرات کے سائیکلون، مہادیپ کے سونامی اور مہاراشٹر کی بارش کے قہر اُن پر مسلّط ہیں۔ کسی کو ہوا اُڑائے لیے جا رہی ہے۔ کسی کو پانی بہائے لیے جا رہا ہے۔ وہ ڈوب رہے ہیں، چلّا رہے ہیں۔ کوئی سننے والا نہیں، کوئی دیکھنے والا نہیں اور کوئی بچانے والا نہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے ہی وہ اپنے مکانوں میں داخل ہوں گے، سب دھڑام سے ہو جائے گا۔ کسی کو اپنے مکان کی فکر ہے، تو کسی کو اپنی مُرغیوں اور بکریوں کی۔ کوئی گرستی کو رو رہا تھا، تو کوئی؛ مال و زر کو۔

منتری رام اوتار بھی رات کے تین بجے سے چھ بجے کے درمیان دوبارہ زلزلہ آنے کی افواہ سن کر سرکاری بنگلے سے اپنے پریوار کے ساتھ باہر آگئے تھے۔ منتری جی کے ملازموں نے ان کی خوش نودی میں ان کا سارا سامان باہر نکال لیا تھا۔ صرف مال وزر جو سیف میں بند تھا، اس کے لیے منتری جی کے ذہن میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے: ''سیف کی چابی تو دی نہیں جاسکتی کسی کو، کیوں کہ چابی دینے سے سب راز عیاں ہوجائے گا۔ گھر کے چراغ سے ہی تو آگ لگتی ہے۔ مال وزر کا کوئی شمار تو ہے نہیں۔ اس کو اِدھر اُدھر چھپا کر حادثے کے بعد بھی تو یہ حرام خور نوکر بتیا سکتے ہیں۔''

سڑکوں پر بڑھتی بھیڑ دیکھ کر اُنھیں لگا جیسے چیونٹیاں اپنے انڈے بچے مُن ✕ ہ میں دبائے کسی بھیانک طوفان کی زد میں آکر اپنے بلوں سے باہر آگئی ہوں۔ پریشان چیونٹیاں، بدحال چیونٹیاں گھبرائی ہوئی، کبھی اِدھر، کبھی اُدھر۔ جیسے مکھیاں بلبلائی ہوئی، کبھی ادھر، کبھی اُدھر؛ بنا ارادہ، بنا سمت، بس مقصد ہے تو صرف جان بچانا، سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ جیسے قیامت آئی ہو۔ ایک محشر بپا ہو، جیسے۔ بس چیخ پکار، نفسی نفسی، الاماں الاماں۔ اس کے علاوہ ان کے ذہن میں اور بھی کئی سیاسی کھچڑیاں پک رہی تھیں۔ جب انھیں کھچڑیوں میں کالی دال نظر آتی تھی تو اُن کے چہرے کی ہوائیاں اُڑنے لگتی تھیں۔ جب چاول دکھائی دیتے تھے، تو چہرہ کھل اُٹھتا تھا۔ سینہ پھول جاتا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی ہو جاتی تھیں۔ کبھی دال اُوپر تو کبھی چاول، اور کبھی دونوں لاوے کی طرح اُبل کر باہر آجاتے تھے۔ کشمیر کے زلزلہ زدہ افراد میں اُن کو طرح طرح کے رنگ برنگی خوش نما پھول دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے: کیلنڈلا، بربنا، پینزی، ڈہلیا، سوئٹ سلطان، نسٹرسیم، گل ِ داؤدی، سائنیریا ، باون بیلیا، غزنیا، پیٹونیا، انٹی رائینم، جرینیم، کولیف، ڈائی انتھس، اسپائی ڈر، کوس مس، جوہی، بیلا، چمپا، چنبیلی، وغیرہ کی رنگ برنگی رعنائیاں دکھائی دے رہی تھیں، تو کبھی لاوا آگ اگلتا، سب کو جھلساتا، ملیامیٹ کرتا چلا جاتا تھا، اور لاوے میں طرح طرح کے لعل و جواہر، ہیرے اور پنّے بہتے دکھائی دے رہے تھے۔ اُس زلزلے میں کشمیر کی پہاڑیوں کے گان ✕ وؤں میں جہاں ابھی تک کوئی بھی نہ پہنچ سکا تھا، ان کو برف پر کھلے میدانوں میں لاتعداد ہیرے چمکتے دمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ جن کو کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ وہاں کا خیال آتے ہی اُن کو لگا جیسے حسین پھولوں جیسی بھیڑیں، سرخ سیبوں جیسی بھیڑیں، نرم بالوں جیسی بھیڑیں، اُن کو بلا رہی ہیں: ''آؤ۔۔! میرے درد سنو۔۔! آؤ۔۔۔! میرے حالات دیکھو۔! پہلے بھی تم آتے رہے ہو۔ ہم کو للچائی نظروں سے دیکھتے رہے ہو۔ مگر کل تک یہ انگور کھٹّے تھے۔ تمھاری دست رس سے پرے تھے۔ تم آتے تھے، دیکھتے تھے، چلے جاتے تھے۔ آج یہ تم کو خود آواز دے رہی ہیں۔ تمھارے لیے تڑپ رہی ہیں۔ بے صبری سے انتظار کر رہی ہیں۔ اَب یہ پرستانی پریاں تم سے فریاد کر رہی ہیں۔ آؤ۔۔۔۔! اَب چاہے میرے رخساروں سے کھیلو۔۔! مگر میرے ابّا کو دوا دے دو۔۔! چاہے میری نرگسی آنکھوں کے خمار میں ڈوبو۔۔! مگر مرے بھائی کو ہسپتال میں بھرتی کرا کر علاج کروادو۔۔! چاہے ہمارے گداز جسموں کو ٹٹولو۔۔! مگر رات کی ٹھنڈ سے نجات دِلادو۔۔! اپنے بستر میں چھپالو۔۔!'' منتری جی وہاں راحت کے واسطے پہنچ کر اپنا جھنڈا اُونچا کرنے کے لیے طرح طرح کے خواب بن رہے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے ان کے ماتھے کی لکیریں اچانک گہری ہوگئیں۔ آنکھوں کی چمک بڑھ گئی، سینہ پھول گیا۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ اور سفید سفید چمکتے ہوئے چاول باہر آگئے۔ جس میں کالی کالی دال کا کوئی بھی دانہ نہ تھا۔ پھر انھوں نے سب سے الگ ہٹ کر موبائل نکالا۔ تقریباً دس منٹ تک اپنے گان ✕ و کے راجو سے بات کی۔ اور واپس آکر کسی گہری سوچ میں پھر گم ہوگئے۔

منتری رام اوتار؛ ایک معمولی کسان کے بیٹے تھے۔ دہلی سے تقریباً نو کلو میٹر دور دیہات میں اُن کا ذاتی مکان تھا۔ انھوں نے درجہ سات تک کی تعلیم، گان ✕ و میں ہی حاصل کی تھی۔ بچپن میں لوگ ان کو رامو نام سے پکارتے تھے۔

راجو؛ ان کے بچپن کا دوست تھا، جو کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس کی ماں رامو کو بہت پیار کرتی تھیں۔ راجو اور رامو اکثر ساتھ رہتے تھے۔ رامو کے والد کی موت کے بعد گھر کے حالات بگڑ گئے تو رامو کی ماں رامو کو لے کر اپنے مائکے چلی گئیں۔ رامو کے ماما کسی پردھان کے یہاں ملازم تھے۔ رامو بھی اکثر اپنے ماما کے ہم راہ پردھان کے یہاں جانے لگا۔ حالات نے کروٹ لی۔ رامو اپنے اخلاق سے گان ✕ و کا ہر دل عزیز بن گیا۔ لوگوں کے مشورے پر اس نے پردھانی کے الیکشن کے لیے تال ٹھونک دی۔ قسمت رنگ لائی اور وہ الیکشن جیت گیا۔ قسمت نے اس کو ایک دن منتری کے عہدے پر پہنچا دیا۔ دولت بڑھی تو انھوں نے اپنے ددھیال کے گان ✕ و میں زمین لے کر تین منزلا عمارت تعمیر کروالی۔

راجو کو کچھ دنوں تک اپنے خطوں کے جواب؛ رامو سے ملتے رہے۔ لیکن جب رامو، رامو سے منتری رام اوتار بنے، تو راجو کو اپنے خطوں کے جواب ملنے بند ہوگئے۔ رامو کے منتری ہونے کی خبر جب راجو نے سنی تو سب سے پہلے اس نے اپنے بچپن کے دوست رامو منتری جی کو فون کیا، لیکن منتری جی نے راجو کو کوئی خاص اہمیت نہ دے کر موبائل آف کر دیا۔ راجو نے ہائی اسکول کرنے کے بعد گان ✕ و میں ہی کرانے کی چھوٹی سی دُکان رکھ لی۔ لیکن جب بھی

وہ اخبار میں منتری جی کی کوئی خبر پڑھتا تو فوراً فون ملاتا، لیکن منتری جی کوئی خاص اہمیت نہ دیتے۔

زلزلے سے اگلے روز منتری جی کی اپیل اخبار میں پڑھ کر لوگ بے حد متاثر ہوئے۔: ''کھلی سڑک پر آپ لوگوں نے رات گزار کر دیکھی۔ یہی رات اگر آپ سب کو کشمیر کے کھلے میدانوں میں برف پر گزارنی پڑتی، تو ذرا سوچو۔۔۔۔! اس کے ساتھ یہ بھی کہ زمین کے زلزلے نے کشمیر کے بیش تر مکانوں کو پل بھر میں مسمار کر کے بے شمار لوگوں کی جانیں لے لیں۔ ان کی گرستیاں پل بھر میں تہس نہس کر ڈالیں۔ جو لوگ بچے، وہ زخمی حالت میں برف کے کھلے میدانوں میں ننگے، بھوکے بے سہارا بِنا علاج کے دم توڑ رہے ہیں۔ جن کے لیے امداد اشد ضروری ہے۔ ذرا سوچو۔۔۔۔! جہاں برف گر رہی ہو، زخمی حالت میں بِنا گھر بار کے، بھوک پیاس میں اگر تم کو راتیں گزارنی پڑتیں، تو کیسا محسوس ہوتا۔۔۔۔؟ لہٰذا مَی※ں ان کی امداد کے لیے حکومت کی طرف سے نوے کروڑ روپے دینے کا اعلان کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ عوام سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ ان کی امداد کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ آپ کی رقم ،حکومت کے نوے کروڑ کے علاوہ بھیجی جائے گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی اعلان کرتا ہوں کہ میرے پاس آنے والے بینک ڈرافٹوں میں خواہ وہ کتنی ہی رقم کا کیوں نہ ہو۔ پہلا ڈرافٹ بھیجنے والے کو حکومت کی جانب سے دس کروڑ روپے انعام میں دیے جائیں گے۔''

اپیل دل دوز تھی، لوگوں نے محسوس کیا کہ کھلے میدانوں کے برف میں زخمی حالت میں بِنا دوا کے بھوکا پیاسا رہنا واقعی دشوار کن ہے۔ ایسی حالت میں لوگوں نے دل کھول کر انعام کے لالچ میں جلدی جلدی بینک ڈرافٹ ارسال کیے۔

ایک ماہ بعد اخبار میں تھا کہ کشمیر کے لیے پہلا ڈرافٹ بھیجنے والے راجو کو سرکار کی جانب سے دس کروڑ روپے کا انعام دیا گیا۔

جب منتری جی کو علم ہوا کہ راجو نے گان※و میں پانچ منزلا عمارت بنوائی ہے تو وہ کب پیچھے رہنے والے تھے۔

اَب اس گان※و میں بس دو ہی فلک بوس عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔

دو سال بعد جب منتری جی اپنے گان※و میں موجود تھے۔ ایک بہت ہی بھیانک زلزلے سے اس گان※و کی بس دو ہی عمارتیں مسمار ہوئیں۔

گان※و والے سوچ میں گم تھے، کہ زلزلے سے متاثر ان دونوں عمارتوں کے لیے امداد کی گوہار کی بھی جائے تو کس کے لیے۔۔۔۔؟ ان دونوں عمارتوں کے اندر کوئی بچا بھی تو نہیں ہے۔☆☆☆☆☆

طاہرہ بیگم کو پڑوس کے لوگوں نے شاید پہلی بار اتنے غصہ میں دیکھا تھا۔ ہمیشہ سب سے ہنس کر بات کرنے والی، نرم مزاج طاہرہ شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھیں۔

''تم لوگ میری عزت کی فکر نہ کرو، جاؤ اپنے اپنے گھر کی بہن بیٹیوں کی حفاظت کرو۔ میرے گھر لچے لفنگے نہیں آتے۔ اور سُن مرادی! شبو کے خالو کے بارے میں ایک بھی غلط لفظ نکالا تو تیرا منہ نوچ لوں گی۔ وہ اس وقت سے آتے ہیں جب تو پیدا بھی نہیں ہوا تھا اور تجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ کیوں آتے ہیں۔ سگے ہیں یا منہ بولے۔۔۔۔۔۔ اور کیسے تو نے یہ کہہ دیا کہ میری لڑکیوں کے رشتے ان کے آنے کی وجہ سے نہیں ہو رہے ہیں۔ ہمارے اندر کیڑے نکالنے والا تو کون ہوتا ہے؟''

''خود تمہارا شبو بھی کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔۔''

مرادی نے بولنے کی کوشش کی لیکن طاہرہ نے پھر ڈپٹ لیا۔

''چپ بدمعاش۔ تجھے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ سارا دن موبائل بجاتا پھرتا ہے۔ جانے کیا کیا اس میں لوڈ کرا رکھا ہے اور اِن کی اُن کی لڑکیوں کے چکر میں رہتا ہے۔ چند سال بڑے شہر میں رہ کر کیا آیا سنک سوار ہوگئی۔ میرا شبو ابھی معصوم ہے تیرے جیسے آوارہ مزاج لڑکوں نے چڑھایا ہوگا۔ سیدھے، سچے انسان کی تم لوگ کیا پہچان کر پاؤ گے۔ خود تمہاری ذہنیت گندی ہے، اس لئے ہر جگہ گندگی نظر آتی ہے۔ کسی کی ہمت کیسے ہوئی یہ کہنے کی، شبو کے خالو آتے ہیں جس سے ہمارے پریوار کی عزت جاتی ہے کون ہے ہماری نیک نامی کا ٹھیکیدار؟ سامنے تو آئے۔ پیٹھ پیچھے کیوں برائی کرتا ہے۔ جس کو جو کہنا ہے میرے منہ پر کہے تب جانوں بڑا مرد کا بچہ ہے!''

پڑوس کے مردوں، عورتوں اور لڑکے لڑکیوں کی ایک بھیڑ سی جمع ہوگئی تھی۔ سب دم بخود طاہرہ بیگم کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا کبھی کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ کس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے، کبھی وہ جاننے کی کوشش میں نہیں رہتی تھیں۔ نہ کسی کے ہاں جا کر بیٹھنے کی عادت تھی۔ سب کے ساتھ ان کا رویہ مخلصانہ تھا۔ لیکن کچھ دنوں سے اندر ہی اندر پڑوس میں ان کے خلاف کھُد بُد

ہو رہی تھی۔ جانے کس نے شوشہ چھوڑا تھا کہ شہر سے موٹر سائیکل سے آنے والے سراج صاحب سے طاہرہ بیگم کا رشتہ کیا ہے؟ اور یہ کہ طاہرہ بیگم کے یہاں اتنی آمدنی کہاں سے ہوتی ہے کہ پورا کنبہ ٹھاٹ سے رہتا ہے۔

ہوا یہ تھا کہ آج جیسے ہی طاہرہ بیگم کے یہاں موٹر سائیکل کھڑی

ہوئی،تو باہر سے ننھا ببلو اندر چلا آیا اور طاہرہ بیگم کے کان میں بات پھُسک دی۔

''خالہ جان باہر کھڑے کچھ لڑکے آپ کے بارے میں بڑی خراب باتیں کر رہے ہیں۔''

پہلے تو طاہرہ بیگم نے نظر انداز کرنا چاہا۔ پھر سوچا ان کی خاموشی سے ان لڑکوں کی ہمت اور بڑھے گی۔ پہلے بھی اس قسم کی باتیں ببلو بتا چکا تھا۔ دھیرے دھیرے ان کا پارہ چڑھنے لگا اور وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔

بڑی مشکل سے رقیہ آپا ہمت کر کے بولیں۔۔۔۔۔۔''جانے دو طاہرہ، بچے ہیں، ناسمجھ ہیں۔''

''نہیں آپا! تم نہیں جانتیں۔ یہ ایسی گندی ذہنیت کے بچے ہیں جن کی غلط تربیت اور آوارہ گردی نے وقت سے پہلے جوان بنا دیا ہے۔ ہر وقت انھیں خرافات ہی سوجھتی ہے اور جیسے خود ہیں ویسے دوسروں کو سمجھتے ہیں۔''

طاہرہ بیگم گھر کے اندر آئیں تو ان کا سانس پھول رہا تھا۔

سراج صاحب باہر ہونے والی باتیں سن کر آنگن میں پلنگ پر چپ چاپ لیٹے ہوئے تھے۔ پاس ہی تینوں لڑکیاں ایک چار پائی پر بیٹھی تھیں۔ طاہرہ بیگم سراج صاحب کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ دیر تک کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ سب اپنی اپنی سمت میں سوچتے رہے۔

یکا یک سراج صاحب ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھے اور سکوت توڑا۔

''طاہرہ! بچے اب بڑے ہو گئے ہیں۔ پڑھ لکھ کر سمجھدار بھی ہو گئے۔ باہر والوں کی باتیں سن کر پتہ نہیں ان کے من میں کیا چل رہا ہو۔ ہمارا کیا رشتہ ہے آپس میں، میرا خیال ہے ان پر اچھی طرح واضح کر دینا چاہئے۔''

''کیا رشتہ ہے؟ کیا یہ نہیں جانتے، بتانے کی ضرورت ہے کیا؟ بچپن سے آپ کو دیکھتے آئے ہیں۔ خالو کہتے ہیں۔ یعنی میرے بہنوئی ہیں آپ، کیا اتنا کافی نہیں ہے؟''

طاہرہ بیگم بے حد افسردہ تھیں۔ حالانکہ باہر میدان میں ان سے کسی نے بدزبانی نہیں کی تھی۔ لیکن انھیں لگ رہا تھا، وہاں موجود سارے لوگوں نے جی بھر کے گالیاں دی ہیں۔

سراج صاحب بولے۔۔۔۔۔۔''نہیں اتنا کافی نہیں۔ اگر اتنا ہی ہوتا تو اور بھی تمہارے بہنوئی ہیں اور سگے ہیں لیکن کوئی اس طرح پابندی سے نہیں آتا۔ تمہارے بھائی بہن اور بھابی سبھی تو ہیں لیکن کبھی کبھار ہی کوئی شکل دکھا جاتا ہے۔ تمہارا دکھ درد بانٹنے نہیں آتا! سنو بچو! اب تم لوگ اتنے بڑے ہو گئے ہو کہ تمام رشتوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ رشتے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ جسمانی رشتے، خون کے رشتے، دل کے رشتے اور روحانی رشتے۔ روحانی رشتے کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ اسی کے زیر اثر جب ایک کو چوٹ لگتی ہے تو دوسرے کو بھی درد ہوتا ہے۔ جسمانی رشتہ کبھی پائیدار نہیں مانا گیا اور آج کے دور میں خون کے رشتے کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی اور دل کے رشتے ہمیشہ ٹوٹتے بنتے رہتے ہیں۔ تم لوگ پہلے مجھے اچھی طرح جان لو۔ میرے نظریہ کو سمجھ لو۔ بچپن سے اب تک مجھے دیکھتے آرہے ہو تو کیا ہوا۔ دیکھنا اور بات ہے کسی کو جاننا اور سمجھنا اور بات! اس کے لئے تم لوگوں کو نصف صدی پہلے کے حالات بتانا چاہوں گا۔ اس وقت لوگ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کی قدر کرتے تھے۔ آپس میں میل محبت سے رہتے تھے۔ خودغرضی نہیں تھی۔ دل کے آبگینے صاف وشفاف تھے۔ جس میں پاکیزہ جذبات ابھرتے تھے۔ تمہاری امی اور مجھ میں کیا رشتہ ہے یہ جاننے کے لئے میری باتوں پر غور کرنا ہوگا۔''

بچے سراج صاحب کی طرف رخ کر کے بیٹھے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ طاہرہ بیگم نے پلنگ سے اٹھنا چاہا لیکن سراج صاحب نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔

''تم بھی سنو طاہرہ آج میں ایک ایسا انکشاف کرنے جا رہا ہوں جس کے بارے میں تم بھی نہیں جانتی ہو کہ اس قدر میرا تم سے لگاؤ کب اور کیوں پیدا ہوا۔ ہمارے درمیان اور کون سا رشتہ ہے؟''

طاہرہ بیگم دوبارہ پلنگ پر بیٹھ گئیں۔''جانتی ہوں اور یہ بچے بھی جانتے ہیں کہ میری ماں اور آپ کی والدہ دونوں چچیری بہنیں تھیں۔ آپ اس وقت سے میرے والدین کے پاس آتے تھے جب اپنے والد کے کندھے پر بیٹھ کر محرم کا چہلم دیکھنے جاتے تھے جو بڑی دھوم سے منایا جاتا تھا۔ اس وقت میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں ان بچوں کو بتا چکی ہوں کہ آپ میرے خالہ زاد بھائی بھی ہیں۔''

''نہیں یہ سب تو نام کے رشتے ہیں، میرا مطلب اس رشتے سے ہے جس کا کوئی نام نہیں ہوتا لیکن اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹتا۔ طاہرہ! ایسا کیوں ہوتا ہے کہ سماج میں لوگ رشتوں کو صرف دماغ سے دیکھتے ہیں اور نفع نقصان کی طرح سوچتے ہیں۔ آج جو کیچڑ تمہارے اوپر اُچھالے گئے، یہ میری برداشت سے باہر ہے اور اب میرے لئے مناسب یہی ہے کہ تمہارے پاس نہ آؤں لیکن اس سے پہلے چاہتا ہوں کہ باہر والوں کی باتیں سن کر اگر ان بچوں کے اندر کہیں کوئی میل بیٹھا ہو تو دُھل جائے!''

سراج صاحب ٹھہر ٹھہر کر، ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہے تھے۔ ان کی آواز میں زمانے بھر کا درد بھر آیا تھا۔ طاہرہ بیگم رو پڑیں۔

''آپ ایسا فیصلہ قطعی نہیں کریں گے۔ دنیا کا کیا ہے، یہ بروں کو اچھا اور اچھوں کو برا ثابت کرتی رہتی ہے۔ پچھلے سال آپ نے جن لوگوں کی خراب وقت میں مدد کی تھی آج وہ بھی خاموش تماشائی بنے رہے۔ کہاں تک ان حرام خوروں کی بات پر دھیان دیں گے۔ ببلو کے ابو اس وقت گھر پر ہوتے تو ایک

سنہ ۶

ایک کی خبر لیتے۔ایسی کہ پھر کسی میں ہمت نہ ہوتی اس طرح کی بات کرنے کی۔ یہ جو مرادی ہے، کوئی کام دھندہ تو ہے نہیں اس کے پاس۔ بس دوسروں کے گھروں میں تاک جھانک کرتا رہتا ہے۔اسی کی لگائی بجھائی ہے سب!''

''لیکن ہے تو کہنے والی بات کہ میں یہاں کیوں آتا ہوں؟ ایسا کون سا رشتہ ہے اس گھر سے؟ میں پڑوس کے لوگوں کو بتانے سے قاصر ہوں۔ میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی لیکن ان بچوں کے ذہن کو صاف کرنا بے حد ضروری ہے۔ اچھا ہے یہ میرے جذبات کو سمجھ لیں گے تو مجھے کبھی مجرم نہیں ٹھہرائیں گے۔تو سنو بچو! تمہاری امی سے مجھے بے انتہا محبت ہے۔اتنی کہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔اس رشتے میں کوئی کھوٹ نہیں، کوئی غرض نہیں۔ بالکل بے لوث ہے۔ہم آج بھی ایک دوسرے سے اپنا اپنا دکھ درد بیان کرتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں چھپاتے اور جانتے ہیں زندگی جتنی بھی ہے، ہنسی خوشی گزار دینے میں ہی جیت ہے۔اب بتاتا ہوں یہ لازوال محبت کب میرے سینے میں سواتی کی بوند بن کر ٹپک پڑی تھی۔تمہاری امی کی عمر اٹھارہ سال رہی ہوگی جب شدید طور پر بیمار پڑیں۔ میں نے ڈاکٹر سے رابطہ کیا، پتہ چلا کہ پرانا استھما ہے، یہ مرض ٹھیک نہیں ہوتا۔میرے دل کو بڑا جھٹکا لگا۔دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ طاہرہ کی زندگی نہایت مختصر ہے۔ اسے خوشیاں نصیب نہیں ہوسکتیں۔ اس رات میں تمہاری امی کی محرومی پر بہت رویا اور خدا سے دعا مانگی، میرے حصے کی تھوڑی زندگی طاہرہ کو مل جائے۔تم لوگ بتاؤ، کوئی لاکھ اپنا ہو، کیا آج کے زمانے میں ایسی بے لوث محبت کرتا ہے؟ میں تمہاری امی کو اکثر سیر کی غرض سے اِدھر اُدھر گھمانے لے جاتا کھلی ہوا میں کہ ڈاکٹر نے کہا تھا کھلی ہوا میں سیر سپاٹے اور تفریح سے مریض کو آرام رہتا ہے۔پھر تمہاری امی کی شادی ہوئی اور میں ان کے مرنے کا انتظار کرنے لگا کیوں کہ ڈاکٹر نے یہ بھی بتایا تھا کہ شادی اور پھر بچے کی پیدائش کے بعد یہ مرض جان لیوا ہوسکتا ہے۔لیکن جیسے تیسے ایک طویل وقت گذر گیا۔تم لوگ پیدا ہوئے اور بڑے ہوگئے۔ میں نے اس گاؤں میں کھلی جگہ تمہارے ابو کے ساتھ مل کر اسی لئے خریدی تھی کہ بہتر آب و ہوا شاید تمہاری امی کی زندگی بڑھادے۔ یہ چھوٹا سا مکان، مکان کے چاروں طرف وسیع آنگن، آنگن میں نیم، آم اور جامن کے درخت لگائے۔ باہر دور تک پھیلے ہوئے کھیت اور باغوں کا سلسلہ۔کتنی فرحت بخش ہے یہ جگہ۔ میں یہاں آتا رہا ہوں لیکن کبھی اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا کہ لوگ میرے آنے پر اس طرح کی باتیں کریں گے۔تو بچو! میں قطعی نہیں چاہوں گا کہ تمہارے پڑوسی تم پر انگلی اٹھائیں اور تمہارا مستقبل خراب ہو۔میں آج کے بعد نہیں آؤں گا!''

طاہرہ بیگم رو رہی تھیں۔بچوں نے جانے کیا سوچا، وہ بھی سسکنے لگے۔

دفعتاً دروازے پر آہٹ ہوئی۔آسیہ بانو اندر آرہی تھیں۔ پیچھے ان کا بیٹا مرادی تھا۔

''طاہرہ بہن! میں شرمندہ ہوں، اس حرامزادے کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی۔آئندہ کبھی ایسی بات نہیں ہوگی۔ہوسکے تو اسے معاف کردیجئے۔''

طاہرہ نے ایک نظر آسیہ کو دیکھا، پھر سراج صاحب کو اور روتے ہوئے بولیں۔

''میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے والی۔مرادی نے ان کی شان میں گستاخی کی ہے۔معافی مانگنا ہے تو ان سے مانگے! لیکن اتنا جان لو، ناحق کسی کو ذلیل کرنا، کسی پر بدچلنی کا الزام لگا کر مشتہر کرنا گناہِ عظیم ہے۔''

اتنا کہہ کر انھوں نے کھلے آسمان پر نگاہ ڈالی جیسے مالکِ حقیقی کا شکر ادا کررہی ہوں۔

☆☆☆

(ریاستِ جموں وکشمیر میں اردو افسانے کی موجودہ صورت حال کا بقیہ)

عمر مجید

عمر مجید کا شمار دورِ حاضر کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔کشمیریت اور کشمیر ان کے افسانوں کا غالب موضوع رہا ہے، بالخصوص یہاں کی رواداری، اخوت، امن پسندی اور مہمان نوازی ان کے افسانوں میں جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔کشمیر پوری دنیا میں مہمان نوازی کے لیے جانا جاتا ہے۔یہاں کے لوگ گھر آئے ہوئے مہمان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اُن کی خوبی یہ ہے کہ وہ مہمان کو کچھ کھلائے بغیر نہیں چھوڑتے۔اس سب کو انہوں نے افسانہ ''محمد شمیم کو کشمیر جانا ہے'' میں یوں پیش کیا ہے:

''وہاں کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں ہم تب تک خود کھانا نہیں کھاتے جب تک نہ گھر بلائے مہمان کی دلجوئی کرتے ہیں۔میرے کشمیر کا ذرہ ذرہ مہمان نواز ہے''۔[5]

الغرض ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ عصر حاضر کے افسانہ نگاروں میں تخلیقی جودت پائی جاتی ہے اور انھیں فن پر دسترس حاصل ہے۔موجودہ دور میں اُردو افسانے کے نہ صرف موضوعات بدل رہے بلکہ افسانے کی تکنیک، کینوس، ہیئت، فن اور اسلوب میں وسیع پیمانے پر تبدیلی آرہی ہے۔لہٰذا آج تخلیق ہونے والی کہانیوں میں موجودہ دور کے انسان کی کہانی ملتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے ریاستِ جموں وکشمیر جن حالات سے دوچار ہے اور بالخصوص یہاں کے عوام جن مسائل سے جھوج رہے ہیں اس کی ہوبہو عکاسی آج کے افسانوں میں ملتی ہے۔یہاں کے ہولناک اور دلدوز حالات وواقعات، گمشدہ افراد، بے نام قبروں کی کہانی، معاشرے میں پھیلی برائیاں، جنسی بے راہ روی، بے گھر ہوئے لوگوں کا درد و کرب آج کے افسانوں میں جلوہ گر ہیں۔آج کے ادیب اپنی کہانیوں میں معاشی، سماجی اور عدم مساوات کے خلاف اپنی آواز اٹھا رہے ہیں اور دقیانوسیت

کے خلاف اپنے غم وغصہ کا اظہار کررہے ہیں۔اس کے علاوہ ان افسانوں میں آپسی بھائی چارے، مذہبی رواداری اور اخوت کی تعلیم بھی ملتی ہے۔

نئی پیڑھی کے افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے یہاں کی ریاستی کلچرل اکادمی رسالہ شیرازہ نکالتی ہے جو کہ ریاست جموں وکشمیر میں موجودہ اُردو افسانے کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ستی سر کا سورج، خالد حسین، پنجاب ادبی سنگیت جموں، ۲۰۱۱ء، ص ۶۱۔
۲۔ کشمیری ثقافت کی عکاسی (ریاستی اُردو افسانے کے تناظر میں)، جاوید احمد میر، جموں وکشمیر میں اُردو افسانہ نمبر، کلچرل اکادمی سرینگر، شمارہ ۱۲۔۱۱، ص ۱۰۵۔
۳۔ آنگن میں وہ، مشتاق مہدی، مہدی پبلی کیشنز ملہ باغ حضرت بل سرینگر، ۲۰۰۹ء۔۲۰۱۰ء، ص ۱۱۵
۴۔ حامدی کاشمیری نمبر، محمد اشرف ٹاک، کلچرل اکادمی سرینگر، کشمیر شمارہ ۴۔۷، ص ۵۵۹۔
۵۔ عمر مجید کے بہترین افسانے، مرتب سلیم سالک، میزان پبلشرز سرینگر ۲۰۰۹ء، ص ۸۹۔

☆☆☆

انیس احمد خاں (نئی دہلی) موبائل۔9811160288

مجھے ایمان کے اندر کوئی ایماں نہیں ملتا
”بہت ہندو مسلماں ہیں کوئی انساں نہیں ملتا“

مرے ناول کے کرداروں کو پوجا ہے زمانے نے
کوئی مجھ سا ادیب اور صاحبِ دیواں نہیں ملتا

زبان کی قینچی نے تو کردیا زخمی گلا میرا

سبھی دانائیاں لے لی ہیں مجھ سے ساری دنیا نے
کوئی میری طرح میرا غنیمِ جاں نہیں ملتا

انیسؔ آسان کہنا بھی بہت دشوار ہوتا ہے
کوئی میری طرح اس دور میں ناداں نہیں ملتا

سنہ ۶

طرحی مشاعرہ

مصرعِ طرح ”بہت ہندو مسلماں ہیں کوئی نساں نہیں ملتا“ پر غزلیں پیش ہیں۔ اگلے شمارے کے لیے طرح نوٹ فرمائیں: ”اس لیے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے (ضیا فتح آبادی) قوافی: جلا، اٹھا، بنا وغیرہ غیرہ۔ ردیف۔ ”رکھا ہے“۔ پانچ اشعار پر مشتمل آپ کی طرحی غزل ۱۵ ستمبر ۲۰۱۷ء تک ہمیں مل جانی چاہیے۔ رسالہ اگر تاخیر سے ملے تو وصول یابی کے ایک ہفتے کے اندر ارسال کر سکتے ہیں۔ (ادارہ)

عبدالمجید فیضی (سمبلپور)

موبائل۔9778291038

قیامِ امن کا دنیا میں اب ساماں نہیں ملتا
بقائے باہمی کا بھی کوئی امکاں نہیں ملتا

غضب ہے عالمِ وحشت، دلوں میں ہے عجب دہشت
حسینوں میں بھی اب کوئی گلِ خنداں نہیں ملتا

نہ دل میں درد کا رشتہ نہ کوئی پاسِ ہم وطنی
”بہت ہندو مسلماں ہیں کوئی انساں نہیں ملتا“

کہاں وہ جوہرِ انسانیت وہ الفتِ باہم
دلِ مضطر! جہاں میں درد کا رشتہ نہیں ملتا

نہ ہم آہنگیٔ باہم نہ وہ حب الوطن فیضیؔ
دلِ اہلِ وطن میں جذبۂ قرباں نہیں ملتا

حمید عکسی (ورنگل)

موبائل۔9985503977

خدا کا گھر تو ہے اس میں کوئی مہماں نہیں ملتا
یہاں بھوکوں کی خاطر کوئی دسترخواں نہیں ملتا

کوئی کافر ہے، کوئی دہریہ ہے، کوئی مشرک ہے
یہ بندے نفس کے ہیں، صاحبِ ایماں نہیں ملتا

جسے دیکھو طلب اس کو رہی ہے دال روٹی کی
کہ جو ہو بے غرض ایسا کوئی ناداں نہیں ملتا

جھگڑتے ہیں یہاں شیخ و برہمن دین و ایماں پر
جو مل جل کر رہے سب سے وہی انساں نہیں ملتا

جہاں ہے راج جنگل کا وہاں حیوان ہیں عکسیؔ
وہاں انسان نہیں جاتا وہاں شیطاں نہیں ملتا

قدیر احمد

موبائل۔9980208578

کسے بتلائیں حالِ دل کوئی پرساں نہیں ملتا
ہماری روح کی تسکین کا ساماں نہیں ملتا

نہیں ہوتا کوئی نسخہ اثر انگیز چارہ گر
مریضِ عشق کو کیوں درد کا درماں نہیں ملتا

بھٹکتا عمر بھر وہ مثلِ آہو ذات کے اندر
شعورِ ذات کا جب تک اسے عرفاں نہیں ملتا

کئی فرقوں میں ذاتوں میں بٹی ہے ذات انساں کی
”بہت ہندو مسلماں ہیں کوئی انساں نہیں ملتا“

گزرنا پڑتا ہے کتنے کٹیلے خارزاروں سے
قدیرؔ یوں راستہ سیدھا کبھی آساں نہیں ملتا

امجد سلیم (کریم نگر)

موبائل۔9550664623

شعور و آگہی کا منبعِ عرفاں نہیں ملتا
ہمیں دیوانِ غالب سا کوئی دیواں نہیں ملتا

بنا غوطہ لگائے علم کے گہرے سمندر میں
کسی موتی کو پانے کا کوئی امکاں نہیں ملتا

مسیحائی وہ کرتا ہے سبھوں کی اس کو کیا کہیے
ہمارے درد کا لیکن اسے درماں نہیں ملتا

مری ہر بات ہوتی ہے کنایوں اور اشاروں میں
خیال اپنا کسی بھی شعر میں عریاں نہیں ملتا

ہمارے ملک میں انسانیت باقی نہیں امجدؔ
”بہت ہندو مسلماں ہیں کوئی انساں نہیں ملتا“

افسر عثمانی (کریم نگر)

موبائل۔9849291973

یہاں پر مہر و الفت کا کوئی ساماں نہیں ملتا
یہاں حیوان بستے ہیں یہاں انساں نہیں ملتا

مقدس ہوگئے حیواں ذلیل و خوار انساں ہے
کہ فکرِ دورِ حاضر کا کوئی پیماں نہیں ملتا

یہاں نفرت ہی پلتی ہے یہاں نفرت ہی بٹتی ہے
یہاں زخمی دلوں کے درد کا درماں نہیں ملتا

چٹائی جن کی مسند تھی شہنشاہِ دوعالم تھے
جہاں بھر میں کوئی بھی آپ سا سلطاں نہیں ملتا

عمر کی ایسے دس ہندوستاں جتنی خلافت تھی
محافظ چھوڑیئے افسرؔ کوئی درباں نہیں ملتا

یونس عاصم (ڈھینکانال، اڑیسہ)

موبائل۔7789811686

خدایا تیری حکمت کا مجھے عنواں نہیں ملتا
اگر ملتا بھی ہے تو اس قدر آساں نہیں ملتا

تری گفتار میں ہمدم بلا کی پارسائی ہے
کہ جس کو تولنے کے واسطے میزاں نہیں ملتا

تمازت دھوپ کی سہنا مقدر بن گیا میرا
گھنے پیڑوں کی چھاؤں کا کہیں امکاں نہیں ملتا

بہت ڈھونڈا کیا میں نے کہ گھر میں آئے گی برکت
مگر افسوس مجھ کو تو کوئی مہماں نہیں ملتا

تمہارے شہر میں عاصمؔ تعجب ہے کہ برسوں سے
”بہت ہندو مسلماں ہیں کوئی انساں نہیں ملتا“

سید اسلم صدا آمری (چنئی)

موبائل۔9444752605

وہ افسانہ کہ جس میں قصۂ جاناں نہیں ملتا
سکونِ قلب کا اس میں کوئی ساماں نہیں ملتا

مروت اور محبت کا کوئی خواہاں نہیں ملتا
”بہت ہندو مسلماں ہیں کوئی انساں نہیں ملتا“

یہاں روشن جبینوں پر سیاہی پھینکی جاتی ہے
نیے اس مسئلہ کا حل کوئی آساں نہیں ملتا

مآلِ قسمتِ ہندوستاں ہے کس قدر روشن
کہ یوگیؔ اور مودیؔ سا کوئی درباں نہیں ملتا

نہیں معلوم اچھے دن صداؔ کب آنے والے ہیں
پریشاں لوگ سارے ہیں کوئی شاداں نہیں ملتا

اجمل محسن (ورنگل)

بدلتے دور کا مجھ کو کوئی عنواں نہیں ملتا
مجھے اس دور میں انصاف کا امکاں نہیں ملتا

بہت ملتے ہیں ہرجا آدمی ہی آدمی لیکن
نہیں ملتا اگر ہے تو ہمیں انساں نہیں ملتا

کسی دن تو ذرا جھانکو کسی بیگار کے دل میں
سوا محنت کی اجرت کے کوئی ارماں نہیں ملتا

بھرے ہیں سارے محبس بے خطاکاروں سے حیرت ہے
جہاں مجرم مقید ہیں وہی زنداں نہیں ملتا

مشقت، عرق ریزی اور محنت چاہیے محسنؔ
سخن ہے بیش قیمت یہ تمہیں ارزاں نہیں ملتا

حفیظ فاروقی (کریم نگر)

موبائل۔9849787701

دلِ ناداں تجھے کیا درد کا درماں نہیں ملتا
غمِ عقبیٰ، غمِ دوراں، غمِ جاناں نہیں ملتا

ہوا ہے مجھ کو عرفانِ عروجِ روز و شب یارب
شکستہ دل میں میرے اب کوئی ارماں نہیں ملتا

دیارِ غیر میں تکیہ کیے سب شاد بیٹھے ہیں
خدا کی ذات سے مایوس کوئی یاں نہیں ملتا

تقدس ابنِ آدم کا ہوا مفقود ذہنوں سے
”بہت ہندو مسلماں ہیں کوئی انساں نہیں ملتا“

حفیظؔ اپنی سناؤ کچھ تمہاری فکر رہتی ہے
نہ سوچو یوں کہ اپنے درد کا درماں نہیں ملتا

ساغر ملارنوی

راجستھان

کہاں لے جائیں اپنا درد ہم درماں نہیں ملتا
جو مرہم دے ہمیں ایسا کوئی انسان نہیں ملتا

بھری دنیا میں مجھ سا بے سر و ساماں نہیں ملتا
لہو سے میرے ارزاں اور کوئی ساماں نہیں ملتا

بڑی کمیاب ہے بھارت میں جنسِ مہر و ہمدردی
”بہت ہندو مسلماں ہیں کوئی انساں نہیں ملتا“

بگاڑا ہے چلن جینے کا ایسا مغربیت نے
سبھی تو آدمی ہیں ایک بھی انساں نہیں ملتا

محبت ہے، بہت تجھ سے مرے اے دیس کی مٹی!
سوا تیرے کوئی ساغر کو جانِ جاں نہیں ملتا

بقیہ صفحہ 67 پر

سنہ ء

ادب پیما

(ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیاں)

ڈاکٹر انتظار نعیم اور جناب تابش مہدی اسلم مرزا کو اعزاز تفویض کرتے ہوئے۔

ڈاکٹر علی عباس امید کے شعری مجموعے برگزیدہ کی رسمِ اجرا بدست ڈاکٹر ظل الرحمن

عکسِ حمید کی رسمِ اجرا کے موقع پر حمید عکسی حب الوطنی پر مبنی اپنی نظم پیش کرتے ہوئے

نام کتاب۔ رباعیاتِ امجد حیدرآبادی کا موضوعی تناظر (تنقید)

مصنف ڈاکٹر قطب سرشار   مبصر: عبدالمتین جامیؔ

چندر بھان خیالؔ اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے۔ساتھ میں دائیں سے محمود ملک، نعیم کوثر اور پروفیسر حسن مسعود۔

جناب چندر بھان خیال کے ساتھ سید نفیس دسنوی

امجد حیدرآبادی بیسویں صدی عیسوی کے ایک مشہور و معروف شاعر گزرے ہیں۔موصوف نے گو کہ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی تھی لیکن ان کی تمام تر شہرت رباعی گوئی کی وجہ سے چہار دانگ عالم میں پہنچ چکی تھی۔ موصوف نے زندگی کے عام موضوعات اور مسائل کو صرف اخلاقی تناظر میں ہی دیکھا نہیں تھا بلکہ قرآن وسنت کی روشنی میں انسان کی رہنمائی کرنے کی سعیٔ بلیغ بھی کی تھی۔ ان کی رباعیاں خود ان کی ذاتی زندگی کی آئینہ دار تھیں۔ذاتی زندگی میں وہ ایک صوفی منش، طبعاً سادہ لوح اور قناعت پسند انسان تھے۔اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان کو کافی عزت سے نوازا تھا اور بعد از وفات بھی ان کا احترام بدستور جاری ہے۔ان کے فن اور شخصیت پر تحریر کردہ پروفیسر قطب سرشار کی کتاب فی الوقت ناچیز کے سامنے ہے۔قطب سرشار صاحب نے اس کتاب میں جا بجا اپنی دینی اور ادبی علمیت کی چھاپ چھوڑی ہے۔بطور خاص رباعیاتِ امجد حیدرآبادی کا موضوعی تناظر میں مطالعہ کرنے کی سعیٔ بلیغ کی ہے۔ قرآنِ پاک کی مختلف آیات کے معانی ومفاہیم کی تشریحات پیش کر کے امجد صاحب کی رباعیوں کے موضوعات سے ان کی مناسبت ومطابقت کو بالغ نظری سے دیکھنے

اور سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ناچیز کے خیال میں موصوف اس ضمن میں سرخرو گزرے ہیں۔ بندہ نمازوں میں سجدہ ریز ہوکر اپنی مجبوری اور عاجزی کا ہی اظہار کرتا ہے۔ پھر اس کے آگے دونوں ہاتھوں کو اُٹھا کر اپنے لئے کچھ نہ کچھ طلب بھی کرتا ہے۔ یہی طلب دعا کہلاتی ہے۔قطب سرشار صاحب نے حضرت امجد حیدر آبادی کی رباعیوں کے حوالے سے اس بات کو اپنے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہی نہیں کہ سرشار صاحب نے امجد صاحب کی ہر بات کو بلا چوں و چرا قبول کرلیا ہے بلکہ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی سوچ اور فکر کو بھی بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔مثلاً

حیرت نہیں بے سایہ اگر ذات ہوئی۔ٹکڑے کیا چاند کیا کرامات ہوئی
دن رات تھا جلوۂ خدا پیش نظر۔معراج ہوئی تو کیا نئی بات ہوئی

اس کی تشریح کرتے ہوئے قطب سرشار صاحب نے ایک جگہ رقم کیا ہے۔''اگر امجد یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ دن رات اللہ تعالیٰ کا جلوہ حضور کے سامنے ہوا کرتا تھا تو اس انکشاف کی دلیل یا کوئی حوالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ پتہ نہیں حضرت امجد کی معلومات کا ماخذ اس حوالے سے کیا ہے''۔

ناچیز کا خیال ہے کہ امجد صاحب نے غالباً ایک حدیث پاک سے استفادہ کرتے ہوئے یہ بات لکھ دی ہو کہ ''نماز معراج المومنین ہے'' حضور اقدسؐ کو ہر نماز میں اللہ کی معراج ہوجاتی تھی۔ بلکہ تمام اصحاب کبّار (رضی اللہ عنہم) کو بھی اللہ کی معراج نصیب ہوتی تھی۔ وہ بھی تمام دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاتے تھے۔اگر نمازوں میں وہ استغراق نہ ہو تو نماز چہ معنی دارد؟

بہرحال اس کالم میں ناچیز یہ بھی کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ ماہرینِ اقبالیات نے بھی اقبالؔ کی تخلیقات میں جابجا قرآنِ کریم کی مختلف آیات کی تفہیم پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن اقبال کے یہاں اسلامی تاریخ کے مختلف ابواب کے فن کارانہ تذکرہ کے علاوہ ان کے افکار و خیالات کا مجتہدانہ اظہار بھی پایا جاتا ہے۔اقبالؔ نے اپنی نظموں،غزلوں اور مضامین میں مذہبِ اسلام کا نئے سرے سے مطالعہ کرنے کی بھی جرأت کی ہے۔یہ ان کی بے پایاں علمیت کا ہی نتیجہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت متنازعہ فیہ ہوکر رہ گئی تھی۔
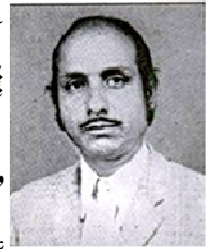
ڈاکٹر قطب سرشار نے خود اپنے طور پر امجد فہمی کی جو کوشش کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ہر خاص و عام قارئین کے لئے بھی اس کتاب میں بہت کچھ موجود ہے جو صرف مطالعہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔امجد حیدر آبادی کے شایانِ شان اس کتاب کو منصہ شہود پر لانے کے لئے میں ڈاکٹر قطب سرشار صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں۔اس کتاب کی قیمت ہے دوسو روپے اور ملنے کا پتہ اخبار اڑیسہ پبلیکیشنز دیوان بازار کٹک۔753001اڑیسہ

نامِ کتاب۔رسوائیاں ہرجائیاں (قطعات)

شاعر۔احمر جیلسری مبصر عبدالمتین جامیؔ

قطعہ چار سطری مختصر نظم ہوتی ہے۔شاعر اپنے خیالات کو صرف چار سطروں میں باندھنے کی کوشش کرتا ہے۔رباعی بھی چہار سطری نظم کے مصداق ہے لیکن اس میں چند مخصوص اوزان کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔قطعہ میں یہ آزادی رہتی ہے کہ اس کے مصاریع غزلوں کی مخصوص بحروں میں سے کسی بھی وزن کو اس میں برتا جاسکتا ہے۔ ماضی چار سے بھی زیادہ اشعار پر مشتمل قطعات کہے جاتے تھے۔لیکن موجودہ عہد میں صرف چہار مصرعی قطعات کہنے کا رواج عام ہوگیا ہے۔ شاعری میں جدید دور کی آمد کے ساتھ ساتھ جس طرح رباعی جیسی صنف سخن پر زوال آگیا تھا قطعہ نگاری کا سلسلہ بھی تقریباً ختم ہونے لگا تھا۔لیکن ان دنوں کئی شعراء کے یہاں اس کے احیا سے دلچسپی نظر آنے لگی ہے۔قطعات کے متعدد مجموعے بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔بعض اہم شعراء اس کو دو بیتی کے نام سے بھی شائع کررہے ہیں۔بہرکیف نام کچھ بھی ہو وہ قطعہ ہی ہوتا ہے۔

احمر جلیس ہمارے عہد کے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے قطعہ نگاری کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہیگر غزلوں اور نظموں سے بھی اردو کے دامن کو مالا مال کررہے ہیں۔موصوف کے قطعات میں درجنوں مضامین مل جاتے ہیں ۔ان میں حمد،نعت،سلام منقبت،شخصیات کے انتقال پر تعزیت،اخلاقی اقدار،استقبالیہ اور مختلف سماجی اور مذہبی تہواروں پر مشتمل قطعات زیرِ نظر مجموعے کی زینت بنے ہیں۔

یہ سبھی قطعات نہ صرف دل پذیر ہیں بلکہ لائقِ مطالعہ بھی ہیں۔ چند قطعات کو یہاں پیش کررہا ہوں جن کے مطالعہ سے ہی قارئین ان کی قطعہ نگاری پر قدرت کا اندازہ لگاسکیں گے۔

حمدیہ قطعہ: خالق دو جہاں ہے تو اللہ۔ مالک کن فکاں تو ہے اللہ
تیرے محتاج بادشاہ و فقیر۔سب کا روزی رساں ہے تو اللہ

نعتیہ: ثنائے خدا ہے کلامِ محمد۔مری زندگی ہے نظامِ محمدؐ

ماہنامہ ''صدائے اڑیسہ'' کا ایک شمارہ سعید رحمانی کے نام
''صدائے اڑیسہ'' کے مدیرِ اعلیٰ سعید رحمانی نے اب تک اردو کے شعر و ادب میں جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اس کے اعتراف میں ایک شمارہ ان کے نام سے شایع کرنے کا منصوبہ ہے۔اہلِ قلم حضرات سے گزارش ہے کہ ان کے فکر و فن پر اپنے مضامین سے نوازیں۔
رابطہ:۔شیخ قریش۔ایڈیٹر صدائے اڑیسہ۔گھماڈیہ۔نیوکالونی
کٹک۔753001(اڈیشا)E.mail:sadaeorissa@gmail.com

TAWAKKAL ENTERPRISES

Poilce Lane, Buxi Bazar,
Cuttack-753001

Tel. : 0671-6548643
Mobile : 9238418643

Stockist of :
Hamdard, Zandu Pharmaceuticals, Dechane, New Shama Labs, Kalonji Oil, Noorani Oil, Qudrati Oil, Royal Ayurvedic Pharmacy Etc.

***Proprietor :* ABDUL AHAD**

Libas

Suit Specialist

Master
F.A. Khan

Ph. : 0671-2428418
Mob. : 9437143877

SUTAHAT
(NEAR TINKONIA BAGICHA)
CUTTACK - 1

WARIS MARKETING

Prop. : SARFARAZ AHMED
Auth. Dealer of
BERGER PAINT INDIA LTD.

SUTAHAT, CUTTACK-1
Mobile : 98612 71704

SHEELA SHOES

Since 1974
A Famous Shop of Designer Ladies, Mens and Kids Footwear

BUXI BAZAR, CUTTACK-1

DWA GHAR

Blood, Urine, Stool,
Pregnancy Etc.
are examined here
*Prop. : **Sd. Sahid Ali***
Mobile : 93376 26958
Deewan Bazar,
Cuttack-1

The famous shop for durable footwear in your city

BOMBAY FOOTWARE

BUXI BAZAR, CUTTACK-1

STYLE 'N' STYLE

(DESIGN FOUNDER)
SHOP NO.A-8, FANCY MARKET
TINKONIA BAGICHA
CUTTACK-1

ALL TYPES OF READYMADE GARMENTS ARE AVAILABLE HERE

PROP. : **LAL BHAI**
MOB. : 09861383643

ALUMINIUM & STEEL FABRICATION

We Deals in :
Aluminium Windows, Sliding Door,
Steel Railing, Balcony,
Fabric & Commercial Door,
Gypsom Roof Ceiling Work

SUTAHAT, CUTTACK-1
Mobile : 90400 48800